MARCH
2023

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

جناب عمران منظور، جناب امجد اسلام امجد اور جناب خالد احمد

خالد احمد ایوارڈ کی تقریب میں جناب امجد اسلام امجد اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔

جناب اعجاز رضوی، جناب نعمان منظور، جناب عمران منظور، جناب نجیب احمد، جناب خالد احمد
جناب امجد اسلام امجد، جناب شہزاد احمد، جناب احمد عقیل روبی اور جناب اعجاز کنور راجہ

غزل

گُل سے یا گلستاں سے ملتا ہے
رنگ کو نم کہاں سے ملتا ہے

اَے دیارِ وصالِ یار ، بتا
ہجر کِس آستاں سے ملتا ہے

سَر بہ زانو اُداس پھولوں کو
زَرِ خوشبُو کہاں سے ملتا ہے

شہر کا حال اے ہوائے جمال
موجِ ریگِ رَواں سے ملتا ہے

زخم کو اپنی زندگی کا پتہ
ناوکِ ناگہاں سے ملتا ہے

حُسن کو حُسنِ بے رُخی خالد
بے کراں آسماں سے ملتا ہے

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا شاریہ

ماہنامہ

بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 31 - مارچ 2023 - شمارہ نمبر: 3

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: خالد احمد، امجد اسلام امجد

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلو میٹر ملتان روڈ لاہور- 53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ www.trackntie.com BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر و پبلشر اور پرنٹر نے زرلیک ایڈ مالی پرنٹرز 16 کلو میٹر ملتان روڈ سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	محمد انیس انصاری، اویس جمیل الغانی	7 تا 8
2	نعت	آصف ثاقب، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، خاور اعجاز، تابش کمال، اعجاز دانش، اکرم ناصر، سرور حسین نقشبندی	9 تا 16
3	عقیدت	مرزا آصف رسول، عارف امام	17 تا 18
4	رباعیات	محمد ارشاد، گلزار بخاری	19 تا 20
5	دائم آباد گوشہ خالد احمد	آصف ثاقب، فرحت عباس شاہ، نعمان منظور، فیصل زمان چشتی، خالد احمد	21 تا 62
6	مضامین	غافر شہزاد، شاہد اشرف، عبدالمناف نجک	63 تا 71
7	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	72 تا 80
8	گوشہ امجد اسلام امجد	حامد یزدانی، سید عارف معین بلے، شہاب صفدر، نعمان منظور، ناصر بشیر، محمد افتخار شفیع، سرور حسین نقشبندی، امجد اسلام امجد، شاہنواز زیدی، عاطف جاوید عاطف	81 تا 117
9	غزلیں	آصف ثاقب، جلیل عالی، جمیل یوسف، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، راحت سرحدی، خاور اعجاز، گلزار بخاری، رشید آفرین، محمد انیس انصاری، منظور ثاقب، طالب انصاری، احمد جلیل	118 تا 202

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
9	غزلیں	اقبال سروبہ، یعقوب پرواز، محمد شفیق انصاری، محمد افضال انجم شوکت محمود شوکت، مسعود احمد، اشرف نقوی، انیس احمد انصر حسن، اکرم ناصر، رضا اللہ حیدر، عقیل رحمانی، افتخار شاہد خالدہ انور، افتخار شوکت، سعدیہ بشیر، شاہد فرید، شہاب صفدر اشرف کمال، ریاض ندیم نیازی، علی حسین عابدی، اصغر علی بلوچ ذکی طارق، ظہور چوہان، تسنیم کوثر، عرفان صادق، رخشندہ نوید شبیر ناز ش، عقیل عباس، علمدار حسین، محمود کیفی، اکرم جاذب احمد محمود، نائیلہ راٹھور، کوکی گل، اسد رضا سحر، عاطف جاوید عاطف سید فرخ رضا ترمذی، وسیم جہان، شہاب اللہ شہاب، میر ایوسف محمد اشفاق بیگ، مہر علی، طالب ہاشمی، مستحسن جامی، زیبا نور زبیر خیالی، محمد طاہر کمال جتوعہ، کاشف واصفی، شاہ زیب ہاشمی وحید احمد قادری، صدام ساگر، امجد خان تجوانہ، رمزی آثمر اکرم حنیف، جاوید صبا، اقرا انصاری، فرح رضوی، محمد نور آسی رخسانہ سمن، ارسلان ساحل، بشیر احمد حبیب، رانا محمد شاہد دانیال احمد زمان، منیر انجم، مزمل اور لیس، سعد سعدی خالق آرزو، سرفراز عارض، عارف امام، محمد علی ایاز، عثمان حنیف عابد معروف مغل، قلب عباس قلبی، جی اے نجم اویس عابس، عاصم بخاری، امجد ہزاروی	118 تا 202
10	افسانے	فرخندہ شمیم، کلیم خاور جی، دردانہ نوشین خان، ثمینہ سید اعجاز روشن، سید تحسین گیلانی، محمد طارق علی	203 تا 220
11	نظمیں	جلیل عالی، حسن عسکری کاظمی، گلزار بخاری، جمشید چشتی تابش کمال، احمد حسین مجاہد، افتخار شاہد، سید فرخ رضا ترمذی افتخار شوکت، نائیلہ راٹھور، قلب عباس قلبی، اعجاز رضوی	221 تا 234
12	خطوط	جمیل یوسف، نسیم سحر، حامد یزدانی، رشید آفرین، ثمینہ سید محمد شفیق انصاری، فیض رسول فیضان، اشرف کمال، رانا محمد شاہد	235 تا 241

حمد

قریہ قریہ شہادتیں تیری
ذہنِ ہر کس پہ دستکیں تیری

جن پر پتھر برسنے چاہئیں تھے
اُن پہ رحمت کی بارشیں تیری

جُھوٹ ہیں پتھروں کے نقلی خُدا
ربِّ واحد! صداقتیں تیری

اللہ اللہ کمالِ کُن فیکون
اللہ اللہ خلقتیں تیری

سانس در سانس داستانِ کرم
لمحہ لمحہ نوازشیں تیری

کس کو زیبا، شمار میں لائے
شرق تا غرب نعمتیں تیری

روزِ اوّل سے روزِ آخر تک
دو جہاں پر حکومتیں تیری

ایک حیرت کدہ کُھلا ہوا ہے
آنکھ ہے اور قُدرتیں تیری

بہر بخشش اُٹھا ہوا ہر ہاتھ
بھیگی آنکھوں میں خواہشیں تیری

ڈھونڈتا پھر رہا ہے، جانِ انیس!
یہ گنہگار بخششیں تیری

محمد انیس انصاری

حمد

خدایا لَم یَلِد ہے تو وَلَم یُولَد بھی ہے مولا
مُسلّم ہے کہ ناپیدا سے کچھ ہوتا نہیں پیدا
کہ عقل و فکر کی حد میں تو یارب آ نہیں سکتا
حدوں سے ہے مبرا حد کے اندر آ نہیں سکتا
جہاں جاؤں جدھر دیکھوں تو ہر شے میں نظر آئے
اِسی پر متفق دونوں ہیں نابینا ہو یا بینا
مری ہر صبح تیرے نور سے ہوتی ہے جلوہ گر
کہ نغمہ سرمدی ہر دم سناتی ہے ہوا تیرا
"وہ دولت تو نے دی مجھ کو کہ ہے سب ہیچ آنکھوں میں
خطا پوشا عطا پاشا کرم سازا خداوندا"
تو الغانی! کو بھی یارب سکھا دے حرف آرائی
کہ تیرے گُن سے ہے یہ کائناتِ رنگ و بو پیدا

اویس جمیل الغانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آنکھ سر پھوڑتی رہی خالد!
اور منہ دیکھتی رہی دیوار

نعتؐ

ہوئے بے تاب رستے میں ثناخوانِ محمدؐ
مسافر قافلے کے تھے غلامانِ محمدؐ

نبوّت پر سبھی اپنے پرائے لائے ایماں
چمک اُٹھی تھی چاروں اور جب شانِ محمدؐ

فرشتوں کا مقدر تھی محمدؐ کی غلامی
بہت سے حاضری میں تھے نگہبانِ محمدؐ

نظر پڑتی نہیں اپنی کہیں بھی اور ایسے
رقم کرتے ہیں ہم سینے پہ فرمانِ محمدؐ

کبھی دہلیز پر اُن کی ہو پیشانی ہماری
دعا ہے ہم کبھی ہو جائیں مہمانِ محمدؐ

ہوئی توحید اور تنظیم کی تہذیب ثاقب
کھلا ہے سب جہانوں میں دبستانِ محمدؐ

آصف ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

قصد مدح کیے بیٹھا ہے پھر خالد احمد
شان خدا، خوشبو کے کنگن، ڈھالے گا لوہار

نعتؐ

دیکھا ہے جب بھی گنبدِ خضریٰ کو روبرو
خیرُالبشرؐ سے ہو گیا ہوں محوِ گفتگو

انؐ کے کرم کی بھیک مجھے ہر گھڑی ملے
پھیلاؤں انؐ کے سامنے دامانِ آرزو

مجھ کو نقوشِ پائے نبیؐ دستیاب ہوں
آنکھوں کو ان پہ رکھنے کی ہے میری جستجو

ہر قریۂ جمال میں ہو اس کا تذکرہ
پھیلیں نبیؐ کی یاد کی خوشبوئیں سو بہ سو

بیٹھا رہوں میں مسجدِ نبوی کے سائے میں
اور اشک بار آنکھوں سے کرتا رہوں وضو

ہوتا رہے ریاض نبیؐ گل فشاں مدام
نشو و نما ہو شاخِ تمنا کی چار سو

سید ریاض حسین زیدی

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

تو نے ہر شخص کی تقدیر میں عزّت لکھی
آخری خطبے کی صورت میں وصیّت لکھی

نعتؐ

نقشِ پا یاد ہے مدینے کا
رہنُما یاد ہے مدینے کا

ہے وہی راہِ راست پر، جس کو
راستہ یاد ہے مدینے کا

دِل مدینے میں چھوڑ آیا ہوں
دلربا یاد ہے مدینے کا

مہر و خورشید جس سے پیدا ہوئے
وہ دِیا یاد ہے مدینے کا

اُنؐ کی آمد پہ جو ملا اِس کو
مرتبہ یاد ہے مدینے کا

کیسے ڈوبیں وہ ناؤ والے، جنہیں
ناخدا یاد ہے مدینے کا

وہی تاریخ میں اہم ہے بہت
واقعہ یاد ہے مدینے کا

ماسوائے مکینِ روضۂ پاک
مجھ کو کیا یاد ہے مدینے کا

اَور تو یاد کچھ نہیں ہے نسیم
بس پتہ یاد ہے مدینے کا

نسیم سحر

نعتؐ

ہر محفلِ میلاد کو مہکایا ہُوا ہے
اِک جھونکا مدینے سے یہاں آیا ہُوا ہے

اُسؐ مہرِ محبت نے مِرے سر پہ رکھا ہاتھ
صد شکر مِرے سر پہ بھی اِک سایا ہُوا ہے

اللہ کی مرضی کے علاوہ نہیں کچھ بھی
جو کچھ بھی مِرے آقاؐ نے فرمایا ہُوا ہے

جو لفظ لکھا دائرۂ نعت سے باہر
دیکھا کہ وہ کچھ روز میں بے مایا ہُوا ہے

اِک حرفِ تسلّی کا طلبگار ہے آقاؐ !
دل ، دہر کی بے مہری سے گھبرایا ہُوا ہے

خاور اعجاز

مطلوب ہے اِس سے کہ سمیٹوں گلِ شفقت
دامن تِری چوکھٹ پہ جو پھیلایا ہُوا ہے

مَیں ذرۂ ناچیز ہُوں روشن تِری حُب سے
ہر مہر وگرنہ یہاں گہنایا ہُوا ہے

نعتؐ

عُشاق سے رہتی نہیں دُور آپؐ کی خُوشبُو
ہر قلب کو مہکائے حضورؐ آپؐ کی خُوشبُو

ہے رُوح و دِل و جاں میں اُجالا اُسی دَم سے
کرتی ہے عطا کیف و سُرور آپؐ کی خوشبُو

اِک نُور عنایات کا پھیلا ہوا ہو گا
آئے گی نظر یومِ نشُور آپؐ کی خوشبُو

پودوں پہ ثمر آیا ہے ، بُور آیا شجر پر
موجود ہے گلشن میں ضرُور آپؐ کی خوشبُو

خالی ہی نہیں کوئی مقام آپؐ کی حُب سے
پہنچی ہے سرِ وادیٔ طُور آپؐ کی خُوشبُو

دیتی ہے یہ آگاہی و عرفان کی دولت
اِنساں کا بڑھاتی ہے شعُور آپؐ کی خوشبُو

تابش ہے مری نعت میں نُور آپؐ کے صدقے
ہر لفظ میں کرتی ہے ظہُور آپؐ کی خوشبُو

تابش کمال

نعتؐ

زندگی سیدِ ابرار کے اکرام سے ہے
ہر خوشی آپؐ کے بخشے ہوئے انعام سے ہے

وہ جو دل چین نہ لیتا تھا گھڑی بھر کے لیے
سبز گنبد کے قریں ہے سو وہ آرام سے ہے

آپ معراج پہ پہنچے تو رکا وقت کا روگ
اس کی حالت میں سکوں بھی اسی گل فام سے ہے

سنگ طائف کے کہیں خار کہیں بلوے سے
صبر! حیرت میں دعا خیر کی اتمام سے ہے

یا نبیؐ آپ کا در سب سے معظم پایا
فاتحِ مکہ تمدن یہی اسلام سے ہے

سنگ نے کلمہ پڑھا شق قمر دیکھا گیا
معجزہ ہوتا عیاں آپؐ کے ہر کام سے ہے

کارِ مدحت بھی اسی در سے ملا ہے دانش
یہ تعلق بھی جو روضے کے در و بام سے ہے

اعجاز دانش

نعتؐ

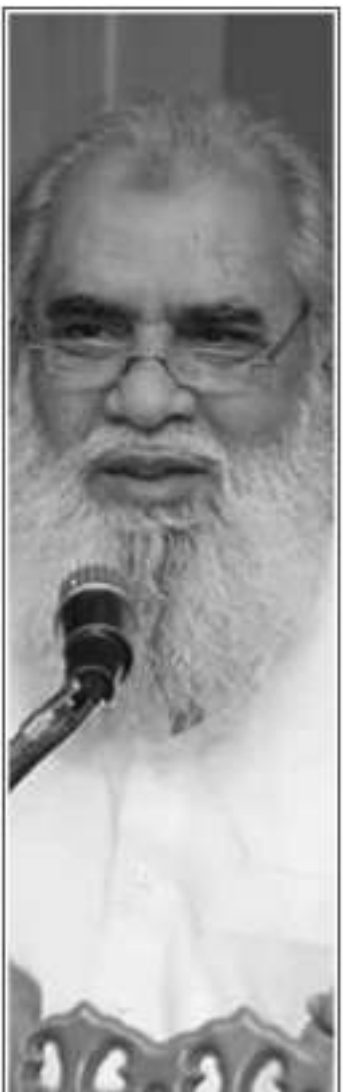

اتنا روشن ہے کہ جتنا نہیں سوچا جاتا
ٹکٹکی باندھ کے چہرہ نہیں دیکھا جاتا

لوگ کہتے ہیں کہ سایہ ہی نہیں ہے، جن کی
آنکھ سے آپ کا سایہ نہیں دیکھا جاتا

ان کی خوشبو ہی بتا دیتی ہے ان کے بارے
کون گزرا ہے گلی سے نہیں پوچھا جاتا

جو ہوئی شان عطا اور کسی کو بھی ملی
ان کے حجرے ہی سے جنت کو ہے رستہ جاتا

تھا کوئی اور بھی اس عظمت و رفعت والا
کہ جسے عرش معلیٰ پہ بلایا جاتا

رب کعبہ نے یہ قرآن میں لکھ بھیجا ہے
ان کی آواز سے اونچا نہیں بولا جاتا

اکرم ناصر

نعتؐ

اب تک سخن ہے خود بھی اوائل کے باب میں
کیا کہہ سکے گا ان کے فضائل کے باب میں

عشرِ عشیر بھی نہیں ان کے کمال کا
لکھا گیا ہے جو بھی خصائل کے باب میں

گر بات ہو خدا کی خدا کے رسول کی
مت سوچنا ذرا بھی دلائل کے باب میں

ہو مستند حوالہ سند بھی ہو متصل
لکھنا اگر ہو ان کے شمائل کے باب میں

قولِ ضعیف حکمِ شریعت سے پرکھیے
کر لیں قبول گر ہو فضائل کے باب میں

کرتے ہیں غیب سے وہی سامانِ حاضری
میں سوچتا ہوں جب بھی وسائل کے باب میں

محرومِ خیر ہوں گے جو سیرت سے دور ہیں
بڑھتے ہی جائیں گے وہ رذائل کے باب میں

بیٹھا ہوا ہوں قدموں میں سرور جھکا کے سر
کرنی ہے عرض اپنے مسائل کے باب میں

سرور حسین نقشبندی

حرفِ نورانی

محمدؐ کا ذکرِ حق نما اِسمُہٗ اَحمَد
ہیں دل جس سے روشن وہ ضیا اسمہ احمد

کروں کاش یوں میں بھی ادا اسمہ احمد
کہ ہو قدسیوں کے نطق سا اسمہ احمد

زہے رَبَّنا وَابعَث پہ حرفِ یُزَکِّیھِم
خوشا استجابِ ہر دعا اسمہ احمد

ہے خود لاشریک اس میں شریک اور فرشتے بھی
ہے کیا مژدۂ صَلِّ عَلیٰ اسمہ احمد!

ابد تک محمدؐ ہی پہ ایماں کا، نصرت کا
ازل سے ہے میثاقِ وفا: اسمہ احمد

جہاں عقل حیراں تھی: ہے عیسیٰ سے کون آگے!
وہاں ابنِ مریم نے کہا: اسمہ احمد

نہیں حرفِ حق میں کوئی تحریف اب ممکن
ہے نطقِ محمدؐ سے ادا اسمہ احمد

یہود و نصاریٰ نے جو گم کر دیے موتی
مجھے مل گئے بن کے ثنا: اسمہ احمد

وہ "دیوارِ گریا" سے چمٹے رہیں گے سر
ہے اُن کی نظر سے ماورا اسمہ احمد

خرد کی سماعت پہ ہیں پردے مفادوں کے
تو دل تک ہو پھر کیسے رسا اسمہ احمد

بروزی و ظلی کا فسوں چل نہیں سکتا
کہ ہے جب تلک حق کا عصا اسمہ احمد

ہے قرآں مُہیمن تو محمدؐ مُصدِّق ہیں
کرے خیر کو شر سے جدا اسمہ احمد

اِذَا جَاءَ نَصرُ اللّٰہِ وَالفَتحُ بھی ہے طے
ہو جب نصرتِ حق کی ندا اسمہ احمد

فعولن مفاعی لن کی دُھن میں نہ بھول، آصف!
کہ سو جاں سے ہے وردِ وفا اسمہ احمد

مرزا آصف رسول

عقیدت

ملکہ زمین ہے! نہ مدینہ زمین ہے
مقصودِ کُن کا نقشِ کفِ پا زمین ہے

دونوں جہان آپؐ کی خاطر بچھے ہوئے
تکیہ ہے آسمان! بچھونا زمین ہے

تصویرِ حسنِ صاحبِؐ عالم ہے کائنات
پیشانیٔ رسولؐ کا صدقہ زمین ہے

ترحیبِ آب و گِل ہے قصیدہ جنابؐ کا
تشبیبِ ماہ تاب ہے! چہرہ زمین ہے

مشکل ہے اِس جمال پہ ٹھہرے کوئی نگاہ
قامت ہے تا بہ عرش تو سایہ زمین ہے

حد نظر کو سرحدِ رحمت کی کیا خبر؟
اس سلطنت کا چھوٹا سا حِصّہ زمین ہے

کونین کی اساس ہے ایوانِ سیّدہ
آنگن بہشت ہے تو احاطہ زمین ہے

اِک دشت کا غرور ہے تفسیرِ مِنّیت*
اِک دشت کے علُو سے مُعلّیٰ زمین ہے

پانی نے ڈھانپ رکھا تھا پنڈا زمین کا
پاپوشِ مصطفیٰؐ نے دِکھایا زمین ہے

عارف امام

*حسین منی وانا من الحسین (حدیثِ رسولؐ)

رباعیات

مت بول کہ ہم نہیں ہیں ایسے
لاٹھی اس کی، ہیں پاس جس کے پیسے
رائج جمہوریت نہیں جنگل میں
لاٹھی میری ہے بھینس تیری کیسے

....

پی لی ہے بھنگ یا چرس یا تاڑی
یا پھر پوری لگی نہیں دیہاڑی
گاڑی چلتی کا نام ہے تو پھر کیوں
پٹڑی پر سے اتر گئی ہے گاڑی

....

خادم اپنوں کے ہیں وگرنہ مخدوم
ایسے خادم کہ ہے جہاں بھر میں دھوم
تر دامن ہم ہیں، شکر رب کا ان میں
عاصی نہیں کوئی بھی، ہیں سارے معصوم

....

ہیں یہ صاحب بھی ماہر علم نجوم
دی ہے وہ خبر کہ چاہیے منھ لیں چوم
کل تک تو نہ تھا پر آج سب اچھا ہے
آٹے کا نہ دال کا ہی بھاؤ معلوم

جس کے جن کے سبب مسلماں ہیں غلام
اک دو ہوں تو لوں اس کے بھتیجوں کا نام
دشمن اسلام کا ، مسلماں کا ہے
ہاں دجّالُ الدّ جاجلہ ___ انکل سام

....

کب تک یہ اندھیر شاہِ تابندہ جمال
ہر شہر میں ہر گاؤں میں ہے لو کا کال
ہے ابرِ سیاہ میں چمکتی بجلی
دے حکم کہ سب اسے کریں استعمال

....

جس جس کی آنکھ میں سؤر کا ہے بال
ہے اس کی نگاہ میں رعایا خوشحال
خرچہ روپیہ آمدن پیسے ہیں
ہونے کو ہے کچھ دنوں میں ٹھَن ٹھَن گوپال

....

ایوان صحافت میں بھی ہیں ٹوٹ بٹوٹ
لگتا ہے کہ آدمی نہیں ، ہیں روبوٹ
کہتے ہیں وہی جو کہلوایا جائے
اللہ جانے ، ہے پاس کس کے ریموٹ

محمد ارشاد

رُباعیات

گلزار بخاری

گلشن میں گل و برگ و ثمر بولتے ہیں
معدن میں کہیں لعل و گہر بولتے ہیں
رحمان کی مدحت کے سوا اور نہیں
پتوں کی زباں سے جو شجر بولتے ہیں

.....

کچھ شکل خوشی کی نہیں جوڑی تو نے
تلخی کی طرف زندگی موڑی تو نے
مٹی میں ملائے میرے اسباب نشاط
خاکم بدہن حد نہیں چھوڑی تو نے

.....

ہے اِذن خوشی سے بحث و تمحیص کریں
پھیلائیں مضامین کہ تلخیص کریں
لیکن یہی درخواست ہے نقادوں سے
تنقید کے پردے میں نہ تنقیص کریں

.....

بدخواہِ بشر دشمنِ تقدیس ہے کون
اور اس کے سوا پیکرِ تلبیس ہے کون
لیکن یہ گزارش ہے کہیں کیا یا رب
اِبلیس جو پوچھے میرا اِبلیس ہے کون

.....

ہے طے شدہ دستور زمانے کے لیے
یہ امر نہیں دِل سے بھلانے کے لیے
واپس پلٹ آنے کی نہیں کوئی سبیل
جس سمت ہیں رستے کئی جانے کے لیے

خالد احمد کی غزل!! اختصاریہ!!!

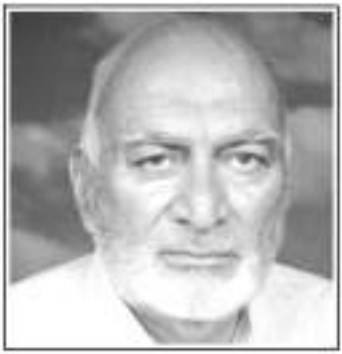

اردو شاعری عہد بہ عہد دل پزیری اور خوش ادائی کی کروٹیں لیتی رہی ہے یہ ولی، میر، غالب اور اقبال تک تحصیلِ مزاج کی ضرورتیں بجالاتی رہی ہے۔ اس بادۂ خاص میں خیال یہی ہے کہ جدید عہد میں اسے خالد کا سا توانا امیجسٹ Imagist ملا ہے۔ اس کی طبیعت میں جو آمد خدائے بخشی ہے وہ سخن فہمی کے باب میں مسرت آمیز ہے۔ خالد احمد نے بعد کے مشاہیر میں نئے دل ربا اسلوب اور نئے رنگ ڈھنگ سے مقبولیت پائی ہے۔ خالد احمد کی غزل میں ایمائی افتاد کا منشور اس آدھا سچ میں مستور ہے:

حسِ جمال جاگتے ہی جانے کیا ہوا
پتھر کی طرح میں ترے آنگن میں آ گرا

.....

خالد احمد کی امیجری ذوق و شوق کی حشر ساماں ہے۔ غزل پر شاعر کی شخصیت اور طبیعت اثر انداز ہو تو لطیف ذائقے (ذوق) کا تاثر وجود پاتا ہے۔ خالد احمد کی تغزل آشنائی اور طبیعت داری دونوں میٹھے ہیں۔ اس اعتبار سے شاعر کو انفرادیت کا بادشہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ الفاظ کی اجنبیت کو جان پہچان کے چولہے میں سامنے لانا اس کا کمال ہے۔ معنویتوں کو دور اذکار تہوں سے نکال کے رمز آشنائی اس کا اسلوب ہے اور قرینۂ اظہار ہے۔ اس مناسبت سے خالد احمد کے چند اشعار:

جسم اور عشق کے حوالے سے
میں تری روح میں اتر جاؤں

.....

کچھ چھپایا نہ ہم سے دنیا سے
عشق ہم نے کیا بھرے بازار

.....

اپنی جوت جگانا خالد اپنے الاؤ بنانا
اپنے عشق میں میرے جیسا اپنا حال نہ کرنا

آصف ثاقب

ہم پر نہ چلے گا بس تمھارا
ہم لوگ یہ جنگ لڑ چکے ہیں

خاک پر خاک کی ڈھیریاں رہ گئیں
آدمی اُٹھ گئے نیکیاں رہ گئیں

.....

خاصا یہ کہ خالد احمد کے حق میں راوی چین لکھا ہے۔ غالب کا یہ شعری منشور خالد احمد کے سے دست و قلم کو خوب خوش آیا ہے:

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کے دہر میں
تجھ سے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

.....

اسی منشور سے ''خونِ دل میں ڈبوئی ہیں انگلیاں'' کا بیانیہ مرتب ہوا۔
خالد احمد نے خلاقانہ جدّت کے کئی ہفت خواں طے کیے ہیں۔ غزل کی لہریں ماضی بعید سے اٹھیں اور بروئے حال تلاطم میں آ گئیں۔ غزل کی تاریخ میں نیرنگیوں کا کچھ شمار نہیں۔ ولی دکنی کہتے ہیں:

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا
شاید کہ اُسے حال مرا یاد نہ آیا

.....

غزل موج در موج آگے چلتی ہے۔
سراج اورنگ آبادی:

ہمیشہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ داری

میرزا جان جاناں مظہر دہلوی:

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

.....

اقبال کے ایک دو شعر کافی نہ ہوں گے۔ کہ اقبال نے غزل کو معتبر علامتی اظہار بنا دیا ہے۔
بیخود دہلوی:

نمک بھر کر مرے زخموں میں تم کیا مسکراتے ہو
مرے زخموں کو دیکھو مسکرانا اس کو کہتے ہیں

جوش:

سوزِ غم دے کے مجھے اس نے یہ ارشاد کیا
جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا

حسرت موہانی

شعر دراصل وہی ہیں حسرت
سنتے ہی جو دل میں اتر جائیں

سراج لکھنوی:

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے
اک ذرا آپ کو زحمت ہو گی

قلندر بدھ سنگھ:

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
روتا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

احمد ندیم قاسمی:

میری پہچان تو مشکل تھی مگر یاروں نے
زخم اپنے جو کریدے ہیں تو پایا ہے مجھے

شکیب جلالی:

آ کر گرا تھا ایک پرندہ لہو سے تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

.....

غزل کی انواع واقسام موجیں کسی ایک جگہ بند ہیں۔ یہ عہد بہ عہد اپنا رُخ بدلتی رہی ہیں۔ یہ ایک زبردست احساس لے کر خالد احمد تک پہنچی ہیں۔ فاصلے فاصلے کے روپ سروپ بیاں لائے گئے ہیں۔ ان پر دل جمتا ہے۔

کہتے ہیں حقائق کو خوب صورتی سے پیش کرنا ہی شاعری ہے۔ حقائق کی طرح داریاں اور خوش اطواریاں چونکہ ہر زمانے میں منفرد ہیں۔ بدیں وجہ شاعر بھی جدت طلب رہے۔ خالد احمد نے اس عہد کے حقائق کو اپنے اسلوب اور احساس سے برتا ہے اس لیے اس کی غزل گہرے مطالعے کی وجہ سے گھمبیرتا میں رہی ہے۔ اس کے اظہارات میں خوش اسلوبی، اور حسنِ تفکر ہے۔ خالد احمد تغزل کے بالکل نئے اسباب دریافت کرتا ہے۔ اس نے علامتوں، استعاروں اور عشوہ طرازیوں سے ڈکشن کو مالا مال کیا ہے۔ خالد نے شیوا بیانی اور طباعی کے جو جوہر لٹائے ہیں وہ ازقبیلِ شاذ ہیں۔ اس کے تصرّف حسنہ میں متعدد بحروں کے معنوی اور جذباتی پس منظر میں وہ اس ضمن میں لہجۂ اختصاص سے بہرہ مند ہے۔ لہجوں کی نسبت سے اس مضمون میں نئے پرانوں کے اشعار دیئے گئے۔ ان کے مطالعے سے آگے چل کر خالد احمد کے اندازِ تکلم کا تعین ہوتا ہے۔ بحروں کی گونا گونی سے خالد احمد کی فنِ عروض سے یگانگی اور دلی نسبتوں سے آگاہی ہوتی ہے۔ اس خصوص میں خالد احمد کی غزل میں انتخاب درج ہے:

خالد شعور شعر کہاں تھا مجھے ، مگر
اظہار کی خلش تھی کہ شاعر بنا گئی

.....

پانی اُتر گیا مگر آنکھیں بجھا گیا
سیلِ جمال اپنا نشاں تک مٹا گیا

.....

کوئی پائے تو مجھے کیا پائے
کھوئے رہنا ہے نشانی میری

.....

ہر فاصلہ بڑا ہے ، ہر مرحلہ کڑا ہے
سورج اگر ہے پیچھے، سائے کے ساتھ ہولو

.....

پلکوں کی ہتھیلیوں پہ خالد
یادوں کے چراغ جل رہے ہیں

.....

تارے بھی ہمیں راہ دکھانے سے ہیں قاصر
ہم لوگ عجب دشت نوردانِ انا ہیں

.....

محفلِ ماہتاب ہیں ، نجم سحر بنیں تو کیا
لاکھ نیاز مند ہیں، ایک اگر نہیں تو کیا

.....

چوٹ ہو پیار بھرے لہجے میں
ماریئے پھول سا پتھر مجھ کو

.....

کاش آنکھوں کو آس جا لے
ہونٹوں پر تالے پڑ جائیں

.....

مرے حالات مجھ کو چھو نہ پائیں
مجھے ہر حال میں انسان رکھنا

.....

بھولے بسرے جھونکے خالد
کس کی یاد کی دھول اڑائیں

.....

خالد وہ مجھے ہنسا ہنسا کر
کچھ اور اداس کر گیا تھا

.....

روز کے روز اک کنج بسائیں
کاش یہ دکھ تنکے بن جائیں

.....

اسی تنگ و تار اُطاق میں اس کنج کے کسی طاق میں
غمِ یار رکھ کے گیا تھا میں، غمِ روزگار یہیں کہیں

.....

صبح کے سرمئی اجالے تک
رات کا ہم سفر رہا تھا میں

.....

درد بھی موج کے مانند سفر کرتے ہیں
اچھا رہتا ہے فلک پر کوئی تارا ہونا

.....

ان شعروں میں عروضیت کی ''بے مثالی'' تو واضح ہے، مگر سب سے ''نمایاں چیز'' امیجری کا قادرالوجود ہونا ہے۔ ایک 'مستند' سخن فہم کے لیے ان شعروں کے بین السطور جو لطیف کیفیتیں ہیں وہ ایک تحفہ ہیں۔ ان کی تخفگی میں محسوسات موجزن ہیں۔

خالد احمد کی فنی تدریس سے بہت احباب مستفید ہوئے ہیں۔ اس کی حوصلہ افزائی سے بہت لوگ کچھ سے کچھ ہوئے۔ خالد احمد، احمد ندیم قاسمی کا پسندیدہ تھا۔ خالد احمد اور میں ایک ساتھ فنون میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ میں اس کی خاص توجہ کا ''سزاوار'' رہا ہوں۔ میری پہلی کتاب ''درکنار'' کی تقریب امجد اسلام امجد کی صدارت میں لاہور (الحمرا) میں ہوئی تھی۔ میں خالد احمد سے ملا تو اُس نے میرا ہاتھ چوم کر محفل میں میری عزت افزائی کی۔ اُس نے اپنی تقریر میں اس شعر کا ذکر پرلطف پیرائے میں کیا:

ثاقب بیٹھ کے پی لیں
ایک پیالہ چائے

.....

عمران منظور کی ہم نوائی میں خالد احمد نے رسالہ بیاض کے سے خوش اطوار رسالے کا ڈول ڈالا، جو برصغیر میں اہم اشاعتی درجے پر ہے۔ خالد احمد نے مجھے بھی اس رسالے میں عزت بخشی۔ خالد احمد (مرحوم) کے صدقے میں جب سے اب تک 'بیاض' سے منسلک ہوں۔ 'بیاض' سے میرا قلبی تعلق 'فنون' والا ہے۔ خالد احمد کی مہربانی سے 'بیاض' نے مجھے بہت نوازا ہے۔

''بیاض' نے کئی اہلِ قلم کو ادبی شناخت دی ہے۔ 'بیاض' کے ادارے کے لوگ چراغ بدست اس کی تدوین اور تزئین میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ دعا یہی ہے کہ رسالہ ترقی کی اور بھی بے شمار منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھے:

☆☆☆☆☆

کیفیات کے ارتقاء کا شاعر، خالد احمد

ادرا کی تنقید کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ تخلیق کاروں کے درمیان فطری امتیازات کو دریافت بھی کرتی ہے۔ میلانات کا جائزہ لیتی ہے اور موضوعات کے ساتھ ساتھ اسلوب کے تجزیے سے تخلیق کار کی نوع کا سراغ لگاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادرا کی تنقید پہلے سے طے شدہ محدود تنقیدی فریم ورک سے نکل کر تخلیق کار کے انفرادی تخلیقی تشخص تک وہ رسائی حاصل کر لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے جو کسی دوسرے تنقیدی ڈسپلن کو حاصل نہیں رہی۔

خالد احمد کے ہاں اکتساب شعر غالب شعری رویے کے طور پر نظر آتا ہے جس کی بنیادی وجوہات میں پہلی یہ ہے کہ ان کا فطری رجحان فنون لطیفہ سے زیادہ سائنسی علوم کی طرف تھا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی داخلی صورتحال کے اظہار کے بجائے اس کے اخفاء کے قائل تھے اور ان کا نظریہء شعر بھی یہی تھا کہ شعر خیال کو عریاں کرنے کے بجائے نہاں رکھنے کا نام ہے۔ یہ رویہ ہمیں ہرانا پرست اور زیرک انسان کے ہاں ملتا ہے۔ وہ اپنے دکھ، محرومیاں اور حسرتیں بیان کرنے کے بجائے انہیں چھپاتا ہے۔ خاص طور پر ایسے بے حس سطحی سماج میں یہ ضروری بھی ہوتا ہے جو انفرادی دکھوں کے احساس کی شراکت سے محروم ہو اور ہمدردی کی آڑ میں انسانوں کے زخموں کی تشہیر سے طمانیت حاصل کرتا ہو۔

خالد احمد کا فطری رجحان سائنس کی طرف تھا لیکن ان کو جو ماحول ملا وہ کُلی طور پر شعر و ادب کی گہما گہمی سے آباد تھا سو اس ماحول نے خالد احمد کو اپنے رنگ میں یوں رنگ لیا کہ شاعری ان کا اوڑھنا اور بچھونا بن گئی۔ وہ جُز وقتی سائنسی دانشور اور کُل وقتی شاعر ہو کر رہ گئے۔

فرحت عباس شاہ

خالد احمد کا پہلا اکتساب سائنسی استدلال تھا جو مستند فارمولے پر بنیاد رکھتا ہے اور دوسرا اکتساب فنِ شعر ہوا جس نے ان کو آغاز میں ہی صحتِ زبان، تلفظ، عروض اور کرافٹ جیسے محاسن کی شعری اہمیت کا شعور بخشا۔ ان کی تمام شاعری میں لفظی اہتمام کسی سربلند علم کی طرح نظر آتا ہے جسے دور و نزدیک سے بہت واضح دیکھا جا سکتا ہے۔

ہماری کلاسیکی شعری روایت ہو یا انگریزی کلاسیکی روایت لفظ اور زبان کا کروفر اور شکوہ ادبی مرتبے کے تعین کا بنیادی پیمانہ سمجھا گیا ہے۔ خالد احمد کو ہم بڑی شاعری کی اسی روایت کا علمبردار کہیں تو اس میں نہ کوئی مبالغہ ہوگا نہ دروغ۔

خالد احمد نظریاتی طور پر ایک وسیع القلب اور کشادہ نظر صاحبِ ایمان شاعر ہیں جو انسانی فکر کی آزادی کے قائل ہونے کے باوجود سماجی اقدار کو ترجیحی بنیادوں پر ملحوظِ خاطر رکھنے کو انسان کی معاشرتی ذمہ داری قرار دیتے ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ، ''تشہیب'' صنفِ نعت کے غیر اعلانیہ اصول اور قرینوں کا نصاب وضع کرنے کی سعادت لیے ہوئے ہے۔ یہ ایک غیر معمولی بات ہونے کے باوجود ناقدینِ ادب کی آنکھوں سے اوجھل رہی ہے کہ نعت ''تشہیب'' کی اشاعت کے بعد محض ثواب حاصل کرنے کی نیت سے نکل کر ایک الگ شعری صنف کے طور پر اپنے خدوخال ترتیب دے چکی ہے۔ ایسا اس لیے ممکن ہوا کہ فنِ شعر پر خالد احمد کی دسترس میدانِ نعت میں جوہر پذیر ہوئی اور اصول وضع ہوتے گئے۔ صنفِ نعت کا پہلا اصول احترام ہے اور احترام کے تقاضے میں لفظ کے انتخاب کو وہی اہمیت حاصل ہے جو حسن میں رنگ کی شفافیت کو ہے۔ اگر کہیں کسی جگہ رنگ معمولی سے دھبے کی شکل اختیار کر جائے تو حسن اپنی کلیت میں مجروح ہو جاتا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں کئی دفعہ بڑے بڑے منجھے ہوئے شعراء کے ہاں نعت میں لفظ کے انتخاب کی لغزش سے بے مزا ہوا۔ خالد احمد کے ہاں نعت لکھتے ہوئے ادب و احترام کا سلیقہ اپنے کمال پہ نظر آتا ہے۔ تشہیب سے نعت دوم کے چند اشعار دیکھیے۔۔۔

سیدھی سچی ہوں سطر میں
سیدھے سچے ہوں جذبات

لب تک کیوں رہ جاتی ہے
لب تک آنے والی بات

پلکیں کب تک چھانیں گی
مٹی میں رلتے لمحات

آپ چراغ ہیں دیں مشکوٰۃ
دین ہے لو، ضو آپ کی بات

اے پیغام برِ آخر
آیت مطلق آپ کی ذات

آپ کے در پر رکے بغیر
گزر نہیں سکتے لمحات

نورِ ازل ، عقلِ اول
اول اصولِ تشکیلات

آپ تہور کی تجسیم
آپ تمدنِ حسیات

.....

خالد احمد کی نعت کے حوالے سے ایک نہایت اہم بات کی نشاندہی ضروری ہے کہ غزل کے پیرائے میں نعت کہنے والے اگر وہ پہلے شاعر نہیں تو اولین شاعروں میں سے ضرور ہیں۔ غزل کے پیرائے میں نعت کہنے سے اسلوبِ نعت میں جو انفرادیت آئی اس کا سہرا بھی خالد احمد کے سر جاتا ہے۔ ان کے ہاں نعت کے موضوعات میں ذات باصفات اور کائنات کی پاکیزگی و تقدس کی ہم آہنگی روحانیت کا ہالہ بناتی نظر آتی ہے اور یوں لگتا ہے جیسے احترام سے لبریز کیفیات اپنے محبوب کے خیال میں آنکھیں فرش کیے سجدہ ریز ہیں۔ اس حوالے سے خالد احمد بجا طور پر ایک روایت ساز شاعر کے مرتبے پر فائز ہوتے ہیں۔ فن شعر کی معراج عقیدت سے لبریز جذبات سے ہم آہنگ ارفع و اعلیٰ شعری معیار کے بے مثال اور نئے تخلیقی افق کا اردو زبان میں ظہور اتنے ہی بڑے خراج تحسین کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

مجھے کہنے دیجیے کہ اردو زبان و ادب اب بھی فارسی، فرانسیسی، عربی اور انگریزی زبانوں کے مقابلے میں نومولود کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارے محققین اور ناقدین کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم کسی تخلیق کار کے چھوٹے سے چھوٹے کنٹری بیوشن کو بھی احساس ممنونیت کے ساتھ قبول کریں چہ جائیکہ اتنے بڑے اور سنگِ میل کی حیثیت رکھنے والے کام کو نظر انداز کر دیا جائے۔ وجہ یہی ہے کہ جب سے نقد و نظر اور تحقیق کے میدان پر غیر تخلیقی، غیر مخلص اور نااہل مدرسین مسلط ہوئے ہیں اردو زبان و ادب کو ریورس گیئر میں ڈالنے کی کوشش کے علاوہ کچھ سامنے نہیں آسکا۔ مجھے حیرت ہے کہ لفظ اور متن کے مطالعے کے چیمپئنز کی نظر بھی خالد احمد جیسے شعری ناطے پر نہیں پڑی جس کی واضح وجہ یہی ہے کہ ان کو بدیسی تھیوریوں کا واویلا مچا کر توجہ

حاصل کرنے کے علاوہ ان غیر مہذب تھیوریوں کا نا تو اطلاق مقصود ہے نہ تخلیق کار کی دریافت۔ ہمارے ہاں غزل کے ناقدین اور شعرائے مخصوصہ کو ایک خاص قسم کا عارضہ یہ بھی لاحق ہے کہ ان کو تلازموں میں ڈھلا، ردیف قافیہ نبھاتا اور دوسرے مصرعے میں کلاسیکی موسیقی کی طرح سَم پہ بول مارتا چونکاتا شعر عمدہ اور بڑا شعر لگتا ہے۔ نازک کیفیات سے محروم کرافٹ زدگان غزل کی پوری توجہ بحر، اوزان اور تراکیب پر مرکوز ہوتی دم توڑ جاتی ہے اور اگر شعر کا خارجی پیکر ان کے ذہن میں پہلے سے موجود پیکر کے مطابق نہ ہو اور ان کے شعر سازی کے سرسری معیار پر پورا نہ اترے تو بیچارے شعر میں موجود جمالیات کی آبادکاری کے لطف سے یکسر محروم رہتے ہیں اور ستم در ستم یہ بھی ہے کہ اس محرومی کی ذمہ داری لینے کے بجائے یہ ڈریکولے ہر طرح کا الزام شاعر کے سر تھوپنے سے ہرگز نہیں چُوکتے۔

خالد احمد کی شاعری جمالیات کی نوآبادکاری کی شاعری ہے۔ نوآبادکاری اس لیے کہ خالد احمد نے شعرا مخصوصہ کے گرد گھرے رہنے کے باوجود ان کا اثر قبول کرنے سے انکار کر دیا اور شعر کے سکہ رائج الوقت کو رد کر کے اپنے خیال اور فکر کو شعر کے فطری پیکر میں ڈھالا۔

اس ضمن میں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ خالد احمد سکہ رائج الوقت اسلوب میں شعر کہنے کی قدرت ہی نہ رکھتے ہوں؟ تو اس کے جواب میں ان کی کئی ابتدائی غزلیں مثال کے طور پر کوٹ کی جا سکتی ہیں۔ شعر دیکھئے---

ترک تعلقات پہ رویا نہ تُو نہ میں
لیکن یہ کیا کہ چین سے سویا نہ تُو نہ میں

.....

اب یہ وہ اسلوب ہے جو اسی کی دہائی میں ہر سطح پر مقبول تھا۔ عدیم ہاشمی، نجیب احمد، ریاض مجید اور ظفر اقبال سارے ہی اس طرح کا شعر کہہ رہے تھے:

بات سے بات نکلنے کے وسیلے نہ رہے
لب رسیلے نہ رہے نین نشیلے نہ رہے
اشک برسے تو دروں خانۂ جاں سیل گیا
در و چکا تو در و بام بھی گیلے نہ رہے
پھول سے باس جدا فکر سے احساس جدا
فرد سے ٹوٹ گئے فرد قبیلے نہ رہے
ٹیس اٹھتی ہے مگر چیخ نہیں ہو پاتی
تیرے پھینکے ہوئے پتھر بھی نکیلے نہ رہے
موت نے چھین لیا رنگ بھی نم بھی خالد
آنکھ بھی سوکھ گئی ہونٹ بھی گیلے نہ رہے

.....

ایسے لاتعداد اشعار خالد احمد کے کریڈٹ پہ

ہیں جن سے ملتے جلتے اشعار ان کے ہمعصر شعراء کے ہاں پائے جانے کے باوجود ان کا طرۂ امتیاز تو ٹھہرے مگر ان کو ایک اچھے شاعر سے بڑے شاعر کا رتبہ نہ دے سکے جبکہ خالد احمد نے مقبول اشعار کے اس پڑاؤ کو تیاگ کر آگے بڑھنے کو ترجیح دی اور غزل کو رنگا رنگ موضوعات سے نوازتے گئے - میں احمد مشتاق، ظفر اقبال اور عزیز حامد مدنی جیسے کتنے شعرا کے نام گنوا سکتا ہوں جن کی ڈھولکی تو بہت بجی گئی لیکن ان کی تمام شاعری ایک دو مقالوں سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتی- خالد احمد کے ہاں اصناف کی تعداد ہی ان کو ان تمام شعراء سے ممتاز کرنے کے لیے کافی ہے- خاص طور پر ان کی نظم ان کی غزل سے بھی ایک قدم کھڑی نظر آتی ہے- خالد احمد نے غزل اور نظم دونوں میں طے شدہ صنفی تقاضوں سے باہر نکل کر انہیں موضوعات اور مزاج دونوں سطحوں پر ان اصناف کو معیار اور اعتبار بخشا ہے- کہیں کہیں تو غزل اور نظم اتنے قریب بھی دکھائی دیتے ہیں کہ ہیئت کے فرق کے باوجود ان کو الگ کرنا مشکل دکھائی دیتا ہے جبکہ کہیں کہیں ہر صنف اپنی ہیئت کا حق ادا کرتی نظر آتی ہے- اس ضمن میں ان کی شاہکار طویل نظم، ''پہلی پوپھٹی پُروائی'' مثال کے طور پر دیکھی جا سکتی جو صنفی اعتبار سے نعت اور ہیئتی اعتبار سے غزل اور مثنوی دونوں کا پیراہن لیے ہوئے ہے- اور یہ تجرباتی سطح پہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کے ایک سے زیادہ زبانوں کے حسین امتزاج کے باعث ہمارے پورے شعری منظر پر ایک بالکل مختلف اور ایک ایسے منفرد مقام کی حامل ہے جو کسی دوسری نظم کو حاصل نہیں ہو سکا- جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں شاعری کا وفورو توانائی اور قادرالکلامی اتنی زیادہ ہے کہ صنفی و ہیئتی تفریق کہیں بہت پیچھے رہ جاتی ہے اور شعر سر اٹھا کر نمایاں کھڑا نظر آتا ہے- موضوع اور کرافٹ کی سطح پر کسی تخلیق کار کے ہاں ارتقا کی مثالیں دنیا بھر کے ادب میں موجود ہیں لیکن کیفیت کا ارتقاء شاذونادر ہی کہیں کہیں نظر آتا ہے اور یہ اتنی اہم بات ہے جس کی نشاندہی بھی شاید ہی کوئی نقاد کسی تخلیق کار کے حوالے سے کر پایا ہو- میرے خیال کے مطابق یہ اعجاز صرف اور اکی تھیدکو ہی حاصل ہے کہ وہ کیفیت کے ارتقا کا کھوج لگانے اور اس کی پرکھ پرچول کرنے کی اہل ہے ورنہ کم از کم میرے علم میں تو ابھی تک نہیں آیا کہ کوئی دوسری تھیوری کا یا کسی بھی تھیوری کا اطلاق کرنے والے کا کیفیت کے ارتقا کے عمل کی طرف دھیان بھی گیا ہو- خالد احمد کی تمام شاعری میں بالعموم اور نظم میں بالخصوص کیفیت کے ارتقا کا سفر بہت واضح ہے- ایک شرمیلے نوجوان کے جھجک آمیز شعری سفر سے آغاز کرنے والے

خالد احمد کے ہاں لاوارثی کے کرب کو شعروں سے چھپائے رکھنے کی کیفیات سے ہوتے ہوئے محبت، رشتوں کے تقدس کی پاسداری، زندگی کی خون آشام وارداتوں کے رنج، پیاروں کی موت کے الم سے ہوتی ہوئی تصوف اور عشقِ رسول کی کہکشاؤں میں ہلکورے لیتی سرمستی تک ایسا ارتقا نظر آتا ہے جس میں زندگی کی بے ثباتی، دنیا کی بے سمتی اور موت کی حقیقت کے شعور کا نتیجہ تارک الذات و زمانہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

میرے نزدیک انسان کے دوسرے انسان سے ارفع و اعلیٰ ہونے کا ثبوت اس کا باطنی طور پر دوسرے سے زیادہ صاف اور شفاف ہونے کے باعث ہوتا ہے ایک انسان اپنے باطن میں آلائشوں اور آلودگیوں سے جتنا پاک ہوتا جائے گا جتنا خالص ہوتا جائے گا وہ انسانی مرتبے میں اتنا ارفع و اعلیٰ ہوتا جائے گا۔ خالد احمد بنیادی طور پر ایک معصوم، کسی قدر سہمے ہوئے اور انتہائی مثبت اور خیر والے انسان تھے۔ یتیمی انسان کو یا تو مجرم بنا دیتی ہے یا پھر صوفی۔ خالد احمد خوش نصیب تھے کہ یتیمی نے ان کو شاعر اور شاعر سے صوفی شاعر کے رتبے پر فائز کیا۔ میرا گمان ہے کہ اگر کوئی محقق دنیا کے عظیم انسانوں کے بارے تحقیق کرے گا تو ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی نکلے گی جنھوں نے اوائل عمری میں ہی یتیمی سہی ہوگی۔ خالد احمد کے ہاں ایسے بیشتر اشعار ملتے ہیں جن میں یتیمی کے دکھ کو کسی دوسرے دکھ میں چھپا کر بیان کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں دوستوں اور قریبی ساتھیوں کی موت پر لکھی گئی نظموں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو دکھ کی تہ تک پہنچنا ذرا مشکل نہیں ہے۔ اگر صرف یہی تجزیہ کر لیا جائے کہ آخر خالد احمد کے ہاں ایسی نظموں کی تعداد اتنی کیوں ہے جو غالباً کسی دوسرے شاعر کے ہاں نظر نہیں آتی تو وجہ سامنے آجائے گی۔ رنج و ملال کی یہی کیفیات ان کی شاعری کے مسلسل سفر میں درجہ بہ درجہ ارتقاء پذیر نظر آتی ہیں اور ایک سائنسی مزاج شاعر دنیا اور انسانی معاشرے کے گہرے مشاہدے سے روحانیت کی طرف مائل بہ سفر نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری کے بغور مطالعہ سے مجھ پر عیاں ہوا کہ دفتری بے حسی کے آلام سے لیکر انسانی فشار اور ابتری کا ہر المیہ کس طرح ان کو حقیقت اور ابدی سچائیوں کی طرف دھکیلتا صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کی منزل کا سب سے بڑا وسیلہ یہی شعور ہوا کرتا ہے جب دنیا کے ہیچ اور ورائے دنیا کے ارفع و اعلیٰ ہونے کا عقدہ منکشف ہوتا ہے۔ اس راز کو پانے کے لیے کیسے کیسے غموں کی ریاضت سے گزرنا پڑتا ہے، کیسے روحانیت کے مدارج طے ہوتے ہیں اس کے ادراک کے لیے خالد احمد کی

شاعری ایک پورا نصاب فراہم کرتی ہے۔ اگرچہ خالد احمد نے زیادہ تر شعراء کی طرح اپنی شاعری کی بنیاد ذاتی و انفرادی کیفیات کے اظہار پر رکھی لیکن اس کے باوجود رفتہ رفتہ یہ کیفیات ذات کے انفرادی دائرے سے نکل کر کائنات کے دائروں میں پھیلتی چلی گئیں۔ درج ذیل غزل میں موجود احساس اور جذبے کا اظہار دیکھیے ....

اپنے دل کا حال نہ کہنا کیسا لگتا ہے
تم کو اپنا چپ چپ رہنا کیسا لگتا ہے

دکھ کی بوندیں کیا تم کو بھی کھاتی رہتی ہیں
آہستہ آہستہ ڈھہنا کیسا لگتا ہے

درد بھری راتیں جس دم بلکورے دیتی ہیں
دریاؤں کے رخ پر بہنا کیسا لگتا ہے

میں تو اپنی دھن میں چکرایا سا پھرتا ہوں
تم کو اپنی موج میں رہنا کیسا لگتا ہے

کیا تم بھی ساحل کی صورت کٹتے رہتے ہو
پل پل غم کی لہریں سہنا کیسا لگتا ہے

کیا شامیں تم کو بھی شب بھر بے کل رکھتی ہیں
تم سورج ہو تم کو لہنا کیسا لگتا ہے

کیا تم بھی گلیوں میں گھر کی وسعت پاتے ہو
تم کو گھر سے باہر رہنا کیسا لگتا ہے

کم آہنگ سروں میں تم کیا گاتے رہتے ہو
کچھ بھی نہ سننا کچھ بھی نہ کہنا کیسا لگتا ہے

درد تو سانسوں میں بستے ہیں کون دکھائے تمہیں
پھولوں پر خوشبو کا گہنا کیسا لگتا ہے

خود کلامی کا تخاطب لیے اس غزل کا ایک ایک شعر کرب ذات کا آئینہ بنتا شاعرانہ دیوانے پن کے عکس بناتا ہے۔ اسی طرح ایک اور غزل دیکھیے جس میں ذات کے دائرے ٹوٹتے دکھائی دیتے ہیں---

بات سے بات نکلنے کے وسیلے نہ رہے
لب رسیلے نہ رہے نین نشیلے نہ رہے

اشک برسے تو دروں خانۂ جاں سیل گیا
درد چمکا تو در و بام بھی گیلے نہ رہے

پھول سے باس جدا فکر سے احساس جدا
فرد سے ٹوٹ گئے فرد قبیلے نہ رہے

ٹیس اٹھتی ہے مگر چیخ نہیں ہو پاتی
تیرے چھیکے ہوئے پتھر بھی نکیلے نہ رہے

موت نے چھین لیا رنگ بھی نم بھی خالد
آنکھ بھی سوکھ گئی ہونٹ بھی گیلے نہ رہے

.....

اب اس غزل میں معاشرے کے بگاڑ کا کرب پوری طاقت سے مجسم ہوتا نظر آتا ہے۔ خالد احمد ایک خالص شاعر کی طرح کسی مستعار نظریے کے سہارے کے بغیر نوحہ کناں ہے۔۔۔

دستخط کرنے سے پہلے سوچ لو

دستخط کرنے سے پہلے سوچ لو!
منہ سے نکلی بات، روٹھا یار، بچپن کی حدوں میں
آنکھ سے ٹپکا ہوا معصوم آنسو،
ہاتھ سے پھیلی ہوئی فائل کبھی لوٹے نہیں!
سر پر سورج، زیر پا رنگ سیہ تقدیر کی تپتی چمک
قیمتی کاروں کے تلوے چاٹتی ہموار قالینی سڑک
دیکھ اے فکسال سے نکلے ہوئے سکے کی
چمکیلی کھنک!
کان آنکھوں کی طرح حیران ہیں
کھڑکیاں خاموش، دہرے راستے سنسان ہیں
دن کے ڈھائی بج گئے
ایک زنانے کا سناٹا ہوا
تن بدن میں سوئیاں چبھنے لگیں
ایک نامعلوم اندیشہ رگ و پے میں سرایت کر گیا
کیا خبر، اگلی گھڑی کیا حکم ہو
کیا عجب، صاحب کوئی فائل منگا لیں اور
کچھ رکنا پڑے
دان دہکتا کھولتا دن، دفتروں کے در پہ آ کر رک گیا
ایسا لگتا تھا، اس آبادی کی بربادی ہوئے،
مدت ہوئی
پھر نہ جانے کیا ہوا
ایک ہلکم مچ گئی
تن بدن میں سنسنی سی بھر گئی
دفتروں کے بند دروازے کھلے
پا گرفتہ پیڑ کی چھاؤں میں لو چلنے لگی

فائلوں کا پیٹ بھرنا کس قدر دشوار ہے
سرد خانوں میں سنبھالو، زندہ لاشوں کی پرانی
کرم خوردہ فائلیں
یہ ہمارا رزق ہیں، یہ فائلیں گل سڑ گئیں تو
زندہ لاشیں دفن کر دی جائیں گی
یہ ہمارا رزق ہیں
زندہ لاشیں دفتروں کی کھڑکیوں پر دستکیں دینے کو
گھر سے چل پڑی ہوں گی، چلو دفتر چلیں
دن نکل آیا چلو دفتر چلیں
سر کا سودا، دیگچی کے دودھ کے مانند ہے
سر پہ سورج رکھ کے پھرنا، دیگچی چولہے پہ دھرنا
اور اپنی دھن میں سب کچھ بھول جانا ایک
جیسے ظلم ہیں
گرمی بازار تن پگھلا نہ دے
گرم لو سے جسم
کانسی کے اکہرے سینگ گھوڑوں کی طرح تپنے لگے

قیمتیں پارے کی صورت چڑھ گئیں
پارہ چڑھتی قیمتوں کا ساتھ کب دے پائے گا
کپکپاتا، ہانپتا اک آنچ میں، اک آن میں
اڑ جائے گا!
سر جھلس کر رہ گیا
دن ابل کر بہہ گیا
دن! وہ بلتا کھولتا دن، دفتروں کے در پر آ کر رک گیا
دستخط کرنے سے پہلے سوچ لو!
منہ سے نکلی باتیں، روٹھے یار، بچپن کی حدوں میں
آنکھ سے ٹپکے ہوئے معصوم آنسو
زندہ لاشوں کی پرانی، کرم خوردہ فائلیں
آج تک کوئی کبھی لوٹا نہیں!

.....

خالد احمد کی نظم "بام مینا سے اترتی ہوئی ایک نظم" کیفیاتی ارتقا کا ایک واضح ثبوت فراہم کرتی ہے جس میں ذاتی اور سماجی رنج و ملال آگہی کی اس منزل کا سراغ دیتا ہے جو بالآخر دنیاوی معاملات کے فکری تیاگ کا باعث بنتی ہے۔
نظم دیکھیے—

سرِ طاق سماع روشن ہو
اے چراغ دیارِ گویائی
رنگ ٹھہریں دکھوں کے اندھیارے
جھلملا اے ندیم مینائی
ہم سفر غم نے تجھ کو ٹھہرایا
بیکسی نے تجھے وکیل کیا
تیرا دکھ تھا تری توانائی
تیرے غم نے تجھے شکیل کیا
تیرے غم آشنا لبوں کے چمن
آگہی کا نشان ٹھہرے ہیں
تیری غم آشنا نظر کے سخن
روشنی کی زبان ٹھہرے ہیں
بام مینا سے ماہتاب اترا
ہوا سینہ کشاء ایاغِ لحد
جگمگا گورِ آسمانِ سخن
جاگ اے تابشِ چراغِ لحد

.....

درج بالا نظم کو خالد احمد کے احساساتی، جذباتی اور فکری ارتقا کی نمائندہ ترین نظم قرار دیا جا سکتا ہے جس میں شاعر کی داخلی اور خارجی زندگی کے سفر اور سفر کے تجربے سے حاصل ہونے والے نتیجے کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ آخر میں ناقدین ادب کے لیے ایک سوال چھوڑے جا رہا ہوں کہ کبھی غور ضرور کریں کہ آخر کیا عوامل تھے جنہوں نے ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہونے والے ن م راشد کو موت کے بعد اس کے جسد خاکی کو جلا دینے کی خواہش پر مائل کیا اور ایک ادبی گھرانے میں پیدا ہونے والے خالد احمد کے دل میں لحد کی روشنی کی آرزو پیدا کی۔

☆☆☆☆☆

خالد احمد کی شاعری

''عرضِ ہنر'' خالد احمد کی کلیات ہے جس میں ان کی دوسری کتاب ''ہتھیلیوں پہ چراغ'' ہے- ہتھیلیوں پر چراغ میں غزلوں اور نظموں کو جگہ دی گئی ہے- اس کتاب کے پیش لفظ میں شاعر کہتا ہے کہ میں دلوں پر لکھتا ہوں- بہت پہلے شعر کی تعریف میں حسرت موہانی نے بھی یہی فرمایا تھا کہ جو اشعار سننے والے کے دل میں اُتر جائیں وہی اشعار کہلانے کے حق دار ہیں-

خالد احمد اس بات سے صرف آشنا ہی نہیں بلکہ عمل پیرا بھی ہیں اور عمل پیرا ہونے کا لطف یہ ہے کہ وہ اس میں کامیاب بھی ہیں- وہ جو فکر پیش وہ قارئین تک پہنچ جاتی ہے- ان کا بیانیہ اسلوب بیاں شدہ بات کو پُرتاثیر بنا دیتا ہے اور اس کے ساتھ موزوں ترین الفاظ کا در وبست شعر کو چار چاند لگا دیتا ہے- اگرچہ وہ بات کو الفاظ کے پردے کی پوشیدگی بخش دیتے ہیں ان کا بیانیہ انداز اس پوشیدگی کو عین عیان کر دینے میں اپنا کمال دکھاتا ہے- یہی وجہ کہ خالد احمد کے اشعار میں وہ کشش پائی جاتی ہے جو قاری و سامع کے دل پر نقش ہو جاتی ہے اور خالد احمد اس طرح اپنے اشعار لوگوں کے دلوں پر لکھتے چلے جاتے ہیں-

ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ ندرتِ خیال بھی خالد احمد کا خاصا ہے- بیانیہ اسلوب، موزوں ترین الفاظ کا انتخاب اور ندرتِ خیال جب یہ تینوں خصوصیات ایک شعر میں جمع ہو جاتی ہیں تو شعر پوری آب و تاب کے ساتھ سمجھ آتا ہے- ہتھیلیوں پہ چراغ میں شاعر نے اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے نقطۂ عروج پر قدم رکھا اور اس کوشش میں کامیاب بھی رہا-

ان تمام خصوصیات پر دسترس پانے کے ساتھ ساتھ شاعر نے صنائع بدائع کو بھی حسبِ ضرورت استعمال کر کے شعر کے ابلاغ کو وہ وسعت بخشی ہے کہ اس کے اشعار قاری و سامع کے دل میں گھر کر جاتے ہیں- سنتے ہی دل نشین ہونے کے

نعمان منظور

ساتھ ساتھ ذہن نشین بھی ہوتے چلے جاتے ہیں- اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ اشعار جو قاری و سامع کے پسندیدہ اور ذہین نشین ہو جائیں، شاعر کو ادب کا اُستاد بھی بنا دیتے ہیں-

خالد احمد کو بھی یہ مقام حاصل ہے کہ ان کے اشعار نے لوگوں کے دل نشین اور ذہین نشین ہونے کے بعد انھیں ادب کی دنیا کی تخت نشینی کے اعزاز سے نوازا- یہ مقام ان کا ہمیشہ کا مقام ہے- کیوں کہ وہ صرف اپنے عہد کے شاعر نہیں بلکہ ہر دور کے شاعر ہیں-

وہ ایک ایسے نباض کی حیثیت رکھتے ہیں، جس کی پوریں سماج کی نبض پر جمی ہوئی ہیں اور وہ ہر لمحہ بدلتی دھڑکن کو سمجھ رہا ہے اور اپنے اشعار میں بیان کر رہا ہے- سماج کو کوئی بھی عارضہ لاحق ہوا اس کا قلم رواں ہوا اور رو میں ان مسائل کو اس انداز سے بیان کرتا چلا گیا کہ اس کے قلم سے ادب اعلیٰ تخلیق ہو گیا-

وہ اپنے کرب دروں کو بیرونِ ذات میں دیکھتا ہے اور کرب بیرون کو درونِ ذات میں دیکھتا ہے گویا کرب کائنات ہی اس کی دنیا میں کرب ذات ہے- جس مقام پر انسان کی یہ کیفیت ہو کہ اسے اوروں کے دکھ اپنے دکھ لگیں تو انسان کائنات کی آنکھ بن جاتا ہے اور آنکھ کا کام سب دیکھنا ہے جو سب سے مشکل کام ہے- کسی بھی عضو کو تکلیف پہنچے تو آنسو آنکھ سے ہی ٹپکتے ہیں- بالکل اسی طرح کرب کائنات کے مشاہدے سے جو آنسو خالد احمد خان نے ٹپکائے وہ اشعار کے روپ میں ''ہتھیلیوں پہ چراغ'' بنے ہمارے سامنے ہیں- اب ہم کائنات میں بکھرے دکھوں کو ''ہتھیلیوں پہ چراغ'' کی طرح دیکھ سکتے ہیں تو یہ سب خالد احمد کی کاوشوں کا نتیجہ ہے تو آیئے ذرا اس کتاب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں-

کتاب کا آغاز احمد ندیم قاسمی سے اظہار محبت سے کیا گیا ہے- اس نظم سے ہم خالد احمد کی احمد ندیم سے محبت کا جائزہ لے سکتے ہیں- کمال عظمت کے اعتراف کے ساتھ عقیدتوں کے پھول نچھاور کیے گئے ہیں اور کامل حق ادائی کی کاوش کی گئی جو کہ کامیاب و کامران رہی ہے- یہ نظم علامات و صنائع کا حسین مرقع بھی ہے اور خالد احمد کی فنی و فکری صلاحیتوں کا شاہکار ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات کا منہ بولتا ثبوت بھی ہے کہ خالد احمد ہم عصروں کے عیب سے بری تھے- وہ اپنے ہم عصروں کو اپنے ساتھ شمار کرتے ہیں اور جو خوبیاں خود میں دیکھتے ہیں وہی خوبیاں ان میں بھی دیکھتے ہیں- اس نظم کے آخر میں فرماتے ہیں:

خالد، نجیب، گوہر، تائب، قتیل، جعفر
سب کم کنار آئے، سب بے کنار نکلے

.....

اس شعر میں جہاں احمد ندیم قاسمی کی عظمت کا اظہار نمایاں ہے ساتھ ہی ان کی اپنے ہم عصروں سے محبت اور ان کی عظمتوں کے اعتراف کی کیفیت بھی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے- گویا وہ ایسے دوست تھے کہ خود کو دوستوں کی محبت کے لیے وقف کر رکھا تھا اور ان کے

اعتراف میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے۔
گویان کی شاعری سے نہ صرف ان کی فنی وفکری عظمت کا جائزہ لیا جاسکتا ہے بلکہ ان کی شخصیت کے حوالے سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود آگاہ تھے اس لیے خود آگاہی کے مقام پر فائز کیے گئے اور جو خود آگاہ ہو اس سے ایک عالم آگاہ ہو جاتا ہے۔
خالد احمد کی غزل نفاست، عمدگی اور بلاغت کا حسین امتزاج ہے۔ وہ اپنے خطابیہ اور بیانیہ اسلوب بیان میں کرب کائنات کو پیش کرتے ہیں اپنی فکر کو جدید و قدیم طرز کا تڑکا لگاتے ہوئے صنائع و بدائع کے برتاؤ کو شامل کرتا ہے تو ایک نئے انداز کا شعر سامنے آتا ہے اور یہ اچھوتا انداز ہی شاعر کا اسلوب بیاں بن کر سامنے آتا ہے۔ آیئے ان باتوں کی روشنی میں اب ہم ہتھیلیوں پہ چراغ رکھ کر دیکھتے ہیں۔
اس کتاب کی پہلی غزل پر نظر دوڑایئے تمام وہ خوبیاں جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں۔ سب کی سب اس میں اور ان کی تمام غزلیات میں دکھائی دیں گی۔

ان کا عشق، باشعور ہے، ہوشیار ہے اور سمجھ دار ہے وہ ہر گزرتے کرب کو دل پر ضرور لیتے ہیں لیکن چہرے سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیتے۔ کیوں کہ سب جانتے ہیں کہ کسی بھی رونے والے کی اشک شوئی کرنے کے بجائے زمانہ اس پر ہنستا ہے۔ زمانے کی ستم ظریفی سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے لازم ہے کہ زمانے کے سامنے اظہار غم نہ کیا جائے بلکہ اس کام کے لیے کنج تنہائی تلاش کیا جائے:

ترک تعلقات پہ رویا نہ تو نہ میں
لیکن یہ کیا کہ چین سے سویا نہ تو نہ میں

.....

یہ حقیقت ہے چشم عالم کے سامنے اپنا دکھ ظاہر نہ ہونے دیں بلکہ کنج تنہائی میں ہر دکھ خود ہی پھوٹ بہے گا اور غبار دل اسی سے صاف ہونا شروع ہو جائے گا۔ جگ ہنسائی سے بچ کر آپ اپنے آپ کو خود ہی دلاسے دینے کا مقام حاصل کر لیں گے۔
اگر شاعر کسی معاملے کی حقیقی وجہ کو ایک طرف کرے اور اس کے بجائے ایسی شاعرانہ وجہ بیان کرے جو عقلی طور پر تسلیم کی جائے۔ ایسا کرنے کو صنعتِ حسنِ تعلیل کہتے ہیں۔ ہمارے شاعر نے اس کتاب میں اس صنعت کو کئی بار استعمال کیا۔ اس صنعت کے حوالے میں ان کا ایک ایسا شعر جو زبان زد عام ہے۔ آپ کے لیے حاضرِ خدمت ہے۔
کوئی تو رونے لپٹ کر جوان لاشوں سے
اسی لیے تو وہ بیٹوں کو مائیں دیتا ہے
میرے خیال میں میرے لیے تلاش کرنا اگر ناممکن نہ ہو تو بہت مشکل ضرور ہے۔
صنعتوں کو برتنے کے حوالے سے خالد احمد بہت عمدہ صنعت گر ہیں۔ دو ضدوں کو آمنے سامنے لانا اور پھر اس حسنِ ترتیب سے بیان کرنا کہ قاری و سامع صنعتِ تضاد کے استعمال سے حظ اُٹھا سکے۔ ان کا خاصا ہے آیئے اس چاشنی سے لبریز شعر پڑھتے ہیں:
وقت کے ساتھ تقاضوں کو بدل جانا تھا
تجھ کو اے صبح ستم! شام کو ڈھل جانا تھا

صبح اور شام کے تضاد نے شعر کے ابلاغ و حسن وسعت سے نواز رکھا ہے۔ اسی صنعت کا ایک اور خوب صورت شعر پیشِ خدمت ہے:

ارادوں کے تقاضے تھے ارادہ رہے
سمٹ سمٹ کے بھی بازو مرے کشادہ رہے

.....

سمٹ اور کشادہ کا تضاد شعر کو رعنائی خاص سے نواز رہا ہے۔ مشترک صفت کی بنیاد پر کسی ایک چیز کو کسی دوسری چیز جیسا قرار دینا 'تشبیہ' کہلاتا ہے جو شعر کی رعنائی کو دوبالا کرتا ہے اور شعر کے ابلاغ میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ خالد احمد نے کس تشبیہ کو کس طرح استعمال کیا ہے۔

وہ رنگ آنکھ میں ڈوروں کی طرح پھیل گیا
چھلک چھلک کے جو پوروں تک آ گیا آخر

.....

اس شعر میں آنکھ کی سرخ رنگت کو ڈورے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنوں کے بجائے مرادی معنوں میں اس طرح استعمال کرنا کہ حقیقی اور مرادی (مجازی) معنوں میں تشبیہ کا تعلق قائم رہے، استعارہ کہلاتا ہے۔ استعارے کے استعمال سے شعر میں نکھار بھی آتا ہے اور معنوی وسعت بھی پیدا ہوتی ہے۔ ہتھیلیوں پہ چراغ میں شاعر نے جگہ جگہ تشبیہات اور استعارات کا استعمال کیا ہے اور بہت خوب کیا ہے۔ استعارے کا شعر ملاحظہ فرمائیے:

ہم سے ایذا طلب اک ساتھ نہیں مر سکتے
کچھ ترے تیر ہوئے، کچھ ترے نخچیر ہوئے

.....

ہم دیکھتے ہیں کہ محبوب کی دل میں اُتر جانے والی نگاہ کے لیے شاعر نے تیر کا استعارہ برتا ہے۔ جس سے شعر برتنے میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ صنعتِ لفظ و نثر استعمال کرنے میں شاعر نے اپنی فنکارانہ صلاحیت تسلیم کرائی ہے۔ فنی و فکری لحاظ سے شعر کو بہت رعنائی عطا کروئی ہے۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

تو فقط دیکھے گا مجھ کو، چھو نہ پائے گا مجھے
تجھ سے ملنے، سایہ بن کر تیرے گھر آؤں گا میں

.....

ایک ہی شعر میں صنعتِ تضاد اور صنعت جمع کو یک جا کرنے کا ہنر اتنا آسان نہیں کہ اس کی مثال ہر شاعر کی شاعری میں میسر آ سکے۔ لیکن اس کی مثال ہمیں خالد احمد کی شاعری کئی جگہوں پر میسر آتی ہے آیئے ملاحظہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ شاعر نے دو صنعتوں کو ایک ہی شعر میں یک جا کر کے کس قدر ابلاغ اور معنوی وسعت پیدا کی ہے:

کچھ برے تھے، کچھ بھلے تھے، خار کچھ، گلزار کچھ
ہر کوئی انسان تھا، آخر فرشتہ کون تھا

.....

تشبیہ کے ذریعے شعرا اپنے خیال کو بہترین ابلاغ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ تشبیہ لفظی نکھار اور معنوی وسعت کا باعث ہے۔ اس صنعت سے خالد احمد نے کما حقہ استفادہ کیا ہے۔ اس نے نئی تشبیہات اخذ کرنے میں مہارت حاصل کی اور جی بھر کر اسے اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔ اُن کی شاعری میں ہمیں نادر تشبیہات میسر آتی ہیں۔ آیئے ایسی ایک تشبیہ سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

کاٹے مری دلیل سے کیوں وہ مری دلیل
زخمی کرے کوئی میرے خنجر سے کیوں مجھے

.....

اس شعر میں تابعِ برہان، دلیل کو خنجر سے دے کر جس قدر معنوی وسعت حاصل کی ہے- ایسی مثال کم ہی ملتی ہے- جدید طرزِ تشبیہ نے شعر کو ندرتِ خیال کے دربار میں صاحبِ مقام بنا دیا ہے-
خالد احمد ہر صنعت کے استعمال سے رعنائی شعر کو مزید نکھار دینے کے فن سے اچھی طرح شناسائی رکھتے ہیں- اس کیفیت کو یقیناً ہم شاعری میں یدطولیٰ رکھنا کہہ سکتے ہیں- صنعت تضاد کا ایک عالی مرتبت شعر ملاحظہ کیجیے:

ہر شخص حقائق کی کڑی دھوپ کے شر سے
تانے ہوئے اوہام کی چادر نظر آیا

.....

اس شعر کو جو معنی آفرینی بخشی ہے اور جو رعنائی عطا کی ہے اس کا اندازہ اس میں موجود مفہوم کی چاشنی سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے-
اسی صنعتِ تضاد میں مختصر بحر کا شعر بھی ملاحظہ کیجیے جو شاعر کی شعری عظمت کی ایک خوبصورت دلیل ہونے کا اعزاز رکھتا ہے-

زیست کا دشت سمن زار ہوا
بیج کیا درد نے بویا کوئی؟

.....

اس شعر میں دشت اور سمن زار کے تضاد نے جو شعری رعنائی پیدا کی ہے- شعر اس کی وجہ سے جی کرتا ہے کہ اس شعر کو بار بار پڑھا جائے- الفاظ کی موزونیت فکرِ شعر کے مطابق ہے اور پڑھتے ہوئے تضاد کا احساس تک نہیں ہوتا کیوں کہ تمام الفاظ ایک ہی مناسبت سے تعلق رکھتے ہیں- ایسا اندازِ بیاں ہر ایک لکھنے والے کو میسر نہیں آتا-
صنعتِ تضاد میں شعر یوں کہا جائے کہ لفظی حوالے سے صرف ایک ایک لفظ میں تضاد ہو مگر معنوی طور پر دونوں مصرعوں میں مکمل تضاد پایا جائے اس کامل تضاد کے حوالے سے اشعار کم دیکھنے کو میسر آتے ہیں- لیجیے! اس کیفیت سے سرشار شعر پڑھیے اور اپنے ذوق کے تسکین کا سامان حاصل کیجیے:

تیرے دربار کو صد غنچہ بکف کون گیا
غم بہ دل، درد بہ جاں، خاک بسر کون آیا

.....

بظاہر تو لفظی طور پر گیا اور آیا، میں تضاد دکھائی دیتا ہے لیکن معنوی طور پر دونوں مصرعوں پر غور کریں اور سرشار ہو جائیں-
مضمون کے ابتدائیہ میں میں نے کہا تھا کہ خالد احمد ہر عہد کے شاعر ہیں- اس کی شاعری امروز کے ساتھ ساتھ دیروز و فردا کا احاطہ کرتی دکھائی دیتی ہے- ہم جانتے ہیں کہ عصرِ حاضر میں کرونا جیسی وبا نے کس طرح خوف کے آسیب کی آمریت قائم کر رکھی ہے- کیفیت یہ ہے کہ لوگ اپنے سائے سے بھی ڈرتے ہیں- گھروں میں مقفل ہو کر رہ گئے ہیں- مساجد میں باجماعت نماز کی صف کی حالت دیکھ کر دل کی حالتِ زار پر رونا آتا ہے- دل خون کے آنسو روتا ہے لیکن دیکھیے کہ ان کی کیفیت کو خالد احمد نے کتنے سال پہلے سپردِ شعر کر دیا تھا:

بند ہو جائیں گے تالوں کی طرح دروازے
لوگ گھر بیٹھ کے لوگوں کا ہنر دیکھیں گے

.....

اکثر اشعار میں صنعتِ تضاد سے قاری و سامع لطف اندوز ہوتا ہے- تضادِ لفظی و تضادِ معنوی کی اپنی چاشنی ہے لیکن اگر یہ تضاد محاورات کے ذریعے وجود میں آئے تو اس کا اپنا معیار ہوتا ہے جس کا اپنا منفرد مقام ہے- یقیناً اسے بھی تضاد معنوی کی ہی ایک شکل تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اس حوالے سے شعر کہنا آسان نہیں- ان کی ایسی مشکل پسندی ان کی کاملیت کی دلیل ہے- شعر حاضرِ خدمت ہے:

وہ ہم کو اٹھائیں گے ، سینے سے لگانے کو
پلکوں پہ بٹھا کر جو، نظروں سے گرا دیں گے

محاورے ہیں جو معنوی طور پر متضاد ہیں اور ان کے تضاد سے شعر کا معیار اعلان کر رہا ہے کہ بلاشبہ خالد احمد زبان و محاورے کے استاد ہونے کا اعزاز رکھتے ہیں- صنعت لف و نشر میں بھی انھوں نے کئی اشعار کہے ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں اور اردو ادب میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں اور شاعر کے منفرد مقام کا اعلان کرتے ہیں کیوں کہ تخلیق ہی تخلیق کار کے ہنر کی آئینہ دار ہوتی ہے- آیئے اس صنعت میں خالد احمد کا شعر ملاحظہ ہو:

ہر ایک سطر پیامِ سکوت تھی ہم کو
ہر امتحان میں تو نے عجب سوال دیے

.....

شاعر کا یہ خاصا ہے کہ ایک ایک غزل میں کئی کئی صنعتیں استعمال کرتا ہے اس غزل میں صنعت مراعات النظیر کی چاشنی کا لطف اُٹھایئے:

تری رُتوں نے ہمیں چاندنی سمیٹنے کو
ہوا سے ہاتھ دیے، بادلوں سے جال دیے

.....

مختلف اشیاء کو یا مختلف معاملات کو ایک مصرعے میں یک جا کرنا اور حوالے کے ساتھ انھیں بیان کرنے کے عمل کو صنعتِ جمع کہتے ہیں- یعنی مختلف معاملات کو یا اشیاء کو کسی حوالے کے تحت ایک شعر میں جمع کرنے کی صنعتِ جمع کہتے ہیں- آیئے اس صنعت کے حوالے سے ان کا شعر ملاحظہ کیجیے:

ہم پجاری بھی ہیں خالد فقط آزر تو نہیں
بت تراشے ہیں، خدا مانا ہے، خود پوجے ہیں

.....

اس شعر میں خاص بات یہ ہے کہ صنعت جمع کے ساتھ ساتھ لفظ آزر ایک خوبصورت تلمیح ہے جو بت تراشی کے حوالے ایک الگ تاریخ سامنے لے آتی ہے-

بات تلمیح کی چلی ہے تو خالصتاً تلمیح کے حوالے سے خالد احمد کا ایک شعر آپ کی نذر کرنا چاہتا ہوں- اس شعر کو پیش کرنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ روایتی رومانی تلمیح کو مزاحمتی جدیدیت میں شاعر نے جس انداز سے بیان کیا ہے آپ کے ذوقِ استحسان کو ضرور مہمیز کرے گا:

راہ میں ہے درد کا کوہِ گراں
کوہ کن میں بھی نہیں ، میں کیا کروں

.....

دیکھیے 'کوہ کن' کی تلمیح اپنی شیریں کے حصول کے بجائے زندگی کی شیرینی کے حصول کے لیے جس برجستگی سے استعمال کی گئی ہے- اپنی مثال آپ ہے-

قدیم اردو ادب میں صنعتِ ابہام کو بہت اہمیت حاصل تھی- اسے شعر گوئی کی معراج سمجھا جاتا تھا- یہاں تک کہ نقادانِ فن نے اس زمانے کو ابہام گوئی کا دور لکھا ہے- ابہام سے مراد ایک ایسا لفظ استعمال کیا جائے جو کم از کم دو معانی رکھتا ہو- ایک معنیٰ عام استعمال کا ہو اور مشہور ہو لیکن شاعر اس معنی کے بجائے دوسرے معنیٰ استعمال کرے اور حقیقت مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کے لیے قاری یا سامع کو دماغ خرچ کرنا پڑے- لیجیے خالد احمد کا صنعتِ ابہام کا شعر آپ کے ذوقِ مطالعہ کی نذر کرتا ہوں:

تمام دن وہی راہیں، سفر پہ اکسائیں
سفر کی رات جو پاؤں پکڑنے لگتی ہے

.....

ہم جانتے ہیں کہ پاؤں پکڑنے کے عام فہم معنیٰ تو قدموں پہ گرنا، معافی مانگنا یا بہت زیادہ منتیں کرنے کے ہیں لیکن اس کے دوسرے معنی سفر سے روکنا یا چلتے نہ دینا کے ہیں- جو شاعر نے استعمال کیے-

آیئے اب آپ کو خالد احمد کے اس شعر کی طرف لے چلتا ہوں، جس ایک شعر میں وہ اہم ترین صنعتیں استعمال کی گئی ہیں- پہلے مصرعے میں صنعت تجنیس تام جلوہ آرا ہے تو دوسرے مصرعے میں صنعت تلمیح جلوہ افروز ہے- آپ کے ذوقِ مطالعہ کی نذر:

مرا خدا بھی مری بھول کو نہ بھول سکا
پھر ایک پیڑ پہ چلنے کو ہے وہی آرا

ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے مصرعے میں پہلا بھول، خطا کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور دوسرا بھول نظر انداز کرنے کے معنوں میں ہے- دونوں 'بھول' حروف، املا، آواز اور تلفظ میں مکمل یکسانیت رکھتے ہیں- ایسی تجنیس، تجنیس تام کہلاتی ہے- دوسرے مصرعے میں پیڑ اور آرے کی تلمیح حضرت زکریا علیہ السلام کے واقع کی طرف اشارہ کر رہی ہے-

اس مطالعے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ خالد احمد نے جدید اردو ادب کو جدیدیت سے ہم کنار کیا اور اپنے حصے کا کام بطریقِ احسن سرانجام دیا ہے- ان کی صدا طویل عرصہ تک شعری ادب کے ذہن کے گنبد میں گونجتی رہے گی-

خالد احمد عظیم شاعر تھے اور عظیم شعرا کی عظمتوں کو تسلیم کرتے تھے- ''ہتھیلیوں پہ چراغ'' میں بھی کئی عظیم شعرا پر ان کی شہکار نظمیں موجود ہیں- جن میں ان کی شعرا کی عظمتوں کو تسلیم کرتے ہوئے انھیں خراج تحسین پیش کیا گیا ہے- ان شعرا میں خصوصیت کے ساتھ غالب، احمد ندیم قاسمی، مصطفیٰ زیدی، شکیب جلالی، اور مجید امجد کے نام قابلِ ذکر ہیں-

غزلوں کے ساتھ ساتھ ہتھیلیوں پہ چراغ میں نظموں کا معیار بھی اپنی مثال آپ ہے- ان کی شہکار نظموں میں پسِ در، فرار،

سرگوشی، مشورہ، کل، حویلی، اندیشہ، نمود، چراگاہ، اور دستک فقید المثال نظمیں ہیں۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جب تک دنیا قائم ہے، اردو ادب قائم ہے۔ خالد احمد کی صدا گونجتی رہے گی۔

خالد احمد نے کچھ نظمیں قرآنی حوالوں سے بھی کہی ہیں جن کی خوبصورتی مثال 'یٰسین' ہے۔ کچھ پنجابی شاعر کے تراجم بھی کیے جو ہتھیلیوں پہ چراغ میں شامل ہیں۔ جیسے ون وابوٹا اور بشیر منذر کی غزل۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاعر کو معلوم ہے کہ اسے کیا کہنا ہے اور کیا کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے ان کی شاعری اور وہ خود ادب عالیہ میں اعلیٰ مقام پر فائز نظر آئے۔

انسان کی حسِ استحسان نے اپنے اردگرد موجود یا وقوع پزیر ہونے والے مستحسن یا غیر مستحسن معاملات کو بہت زیادہ محسوس کیا بلکہ یوں کہیے کہ وہ اپنی حساسیت کی وجہ سے تمام معاملات سے متاثر ہوا۔ معاملات عمل تھے تو انسان کے منہ سے نکلنے والے کلمات تحسین و نفرین ردِ عمل۔ اُس ردِ عمل کی باز گشت نسل در نسل سنائی دے رہی ہے۔

کوئی بیتے لمحات کا مطالعہ کرتا ہے اور بیان کرتا ہے کوئی خود پر بیتی کو آفاقی رنگ دے کر بیان کرتا ہے تو کوئی جگ بیتی کا مشاہدہ کر کے اپنے لفظوں میں ڈھال دیتا ہے مگر مکمل آفاقیت اس کے کلام میں آتی ہے جو ان تینوں معاملات کو مشاہداتی آفاقیت کے رنگ میں الفاظ کا لبادہ اوڑھا دے۔

خالد احمد نے اپنے کلام میں اسی طریقے کو اپنایا ہے۔ اُن کے مطالعہ میں جو کچھ آیا انھوں نے اس بیش بہا مواد کو ذہن کے خزانے میں رکھا اور اپنے مشاہدے سے حاصل ہونے والے علم کو اس میں شامل کر لیا مزید یہ کہ جو ان پر کیفیات وارد ہوئیں ان سے میسر علم کا ملغوبہ بنا کر آفاقیت کی آب دی اور اشعار کے روپ میں ڈھالتے چلے گئے۔

حسِ استحسان کا مقناطیسی میدان اگرچہ لامحدود نہیں لیکن اس کی حدود کی پہنائیاں ناپنا عمومی پیمائشی نظام کے بس کا روگ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فکرِ انسانی نے زمانہ قدیم میں ہی حسنِ کائنات میں حسنِ ازل کو کھوجنا شروع کر دیا تھا اور رازِ حقیقت علامات میں آشکار ہوا جسے انسان نے عالمات و رموز یا اشارے کنایے میں بیان کرنے کی راہ اختیار کی۔ آخر وہ وقت آ گیا کہ انسان پر رازِ حقیقت واشگاف ہو گیا اور مخصوص پیرائے میں اسے بیان کرنے کی صلاحیت پر انسان نے یدِ طولیٰ بھی حاصل کر لیا۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا؟ انسان کا خالق خود ہی انسان کے اس وصف کی تعریف بیاں کرتے ہوئے ہمیں آگاہی دیتا ہے کہ:

اَلرَّحْمٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ○ عَلَّمَہُ الْبَیَانَ ○

رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی، انسان کی تخلیق کی اور اسے علم بیان عطا کیا۔

یقیناً عطا کرنے والا 'معطی' عطا کر رہا ہے، لیکن جس میں جس قدر قوتِ جاذبیت وہ اس قدر اس

کی دعا کو جذب کرتا جاتا ہے- کوئی جس قدر حاصل کرتا ہے اس قدر ہی بیان کر سکتا ہے-
خالد احمد نے علم بیان کی سیر حاصل تعلیم حاصل کی اور اسے اچھی طرح جذب کیا پھر اپنے اردگرد کے معاملات کا ذہن میں مطعوبہ بنا کر اسے آفاقی انداز بیان میں پیش کیا- احساسات جو خیالات کی ترسیل میں اس کا بیانیہ اسلوب بیاں قاری و سامع کے دل و ذہن میں اس کی بات بٹھا دیتا ہے اور قاری و سامع کو ان کے بیان کیے ہوئے معاملات آنکھوں کے سامنے وقوع پزیر ہوتے دکھائی دینے لگتے ہیں-

''پہلی صدا پرندے کی'' خالد احمد کے کلیات ''عرضِ ہنر'' میں ان کی تیسری کتاب ہے- جس کا دیباچہ نجیب احمد نے لکھا اور تمہید اختر حسین جعفری نے لکھی- جو حقیقت میں پیش لفظ ہی ہے- کتاب میں غزلوں اور نظموں کو جگہ دی گئی ہے، جو نہ صرف ان کے عہد کو آئینہ دکھاتی ہے بلکہ ہر عصرِ رواں کی آئینہ دار ہے- ان کی تخیل آفرینی، علامات و استعارات کا برتاؤ، اور صنائع بدائع کے بروقت استعمال کے ساتھ ساتھ ان کے الفاظ کے در و بست نے شعر کو چار چاند لگا دیئے ہیں- ساتھ ہی ان کے بیانیہ اسلوب بیانیہ نے سونے پہ سہاگے کا کام کیا ہے-

ان کے تجربات کی بھٹی کی آگ نے ان کے اشعار کو کندن بنا دیا ہے یہ وہ کندن ہے جس میں پارس پتھر کی تاثیر پائی جاتی ہے- گویا جو اس کندن سے چھوا خود کندن ہوا- کندن کو نہ مٹی کھاتی ہے اور نہ زنگ- کوئی ایک تیزاب بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوتا- موسمی اثرات اس کی چمک دمک کو ماند نہیں کر سکتے- یہی خوبیاں خالد احمد کی ہیں، یہی خوبیاں ان کی شاعری کی ہیں اور یہی خوبیاں ان کے قاری و سامع میں سرایت کر جاتی ہیں-

انھوں نے اپنے انداز بیاں کے زور سے کما حقہ فیض پایا اور دوسروں کو مسلسل فیض یاب کرنے میں مصروف عمل ہیں- ان کے اشعار کی آبشاریں کوہ غزل و نظم سے رواں دواں ہیں اور ذہنوں کی فصلوں کو سیراب کرنے کا عمل جاری و ساری رکھے ہوئے ہیں-

آیئے ان باتوں کی لو میں ان کی کتاب ''پہلی صدا پرندے کی'' کی آبشاروں سے اپنے اذہن کو سیراب کرنے کے لیے اس کے ورق ورق کی سیر کرتے ہیں- وہ تو صحرا نوردی کرتے کرتے خود ریگستان ہو گئے ہیں اور ریگستان اب ان کی خاک چھانا کرتے ہیں- وہ اپنی اس کیفیت سے آگاہ ہیں- اپنی اس کیفیت کو اپنے خاص انداز سے توضیح کے ساتھ یوں بیان کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں-

ناقدوں نے مجھے پرکھا خالد
خاک صحراؤں نے چھانی میری

.....

علم بیان میں کامل دست گاہ رکھنے کی وجہ سے خالد احمد اکثر اوقات ایک شعر میں دو دو صنعتیں برت جاتے ہیں اور وہ بھی اس خوب صورتی کے ساتھ کہ ایسا کرنے سے شعر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے اور فکر کا ابلاغ

بھی اس طرح ہوتا ہے کہ خیال قاری کے ذہن پر قابض ہو جاتا ہے۔ یہ چیز ان کی اعلیٰ فنی و فکری صلاحیتوں سے ہمیں روشناس کراتی ہے۔ اس حوالے سے ان کا ایک شعر دیکھتے ہیں جس میں صنعتِ تشبیہ اور صنعتِ تضاد ایک ساتھ واضع ہوئے ہیں۔

سحر آثار ، شام کی سرخی
لب جاناں سے چھوٹتی ہی نہیں

.....

اس شعر میں سحر اور شام کے مابین ایک خوب صورت تضاد پایا جاتا ہے اور محبوب کے ہونٹوں کی لال رنگت کو شفقِ شام کی لال رنگت سے تشبیہ دی گئی اور پھر اسی شام کی سرخی کو افقِ مشرق پر صبح کی خبر دینے والی سرخی تشابہ کیا گیا ہے۔ ایسا شعر کہنا ہی خالد احمد کی انفرادیت ہے۔

دنیا میں قدم قدم پر علامات و تشبیہات سے واسطہ پڑتا ہے مگر انھیں استعمال کرنے کا فن ہر کسی کو نہیں آتا۔ تشبیہات و علامات کو نئے انداز سے پیش کرتا ہی انھیں نیا بنا دیتا ہے۔ گویا نئی فکر کو نئے انداز سے بیان کرنا شعر کو نیا بنا دیتا ہے۔ جدید رنگ اور جدید آہنگ سے ہم کنار کر دیتا ہے اور اس پر خالد احمد کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ ان کا ایک اور ایسا شعر پیش کرتا ہوں جس میں انھوں نے صنعت تضاد کے ساتھ صنعتِ تشبیہ استعمال کی ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

یہ شہر کے باسی ہیں کہ اڑتے ہوئے پتے
یہ شہر کے حاکم ہیں کہ جنگل کی ہوا ہیں

.....

ہم دیکھتے ہیں کہ شہر کے باسیوں یعنی لوگوں کو اڑتے ہوئے پتوں سے تشبیہ دی گئی ہے جب کہ حاکم کو جنگل کی ہوا سے تشبیہ دی گئی ہے باہم ربط کی مضبوطی کا سبب یہ ہے کہ ہوا اپنی مرضی سے خشک پتوں کو جس طرف چاہے ادھر اڑا لے جاتی ہے اور شہر کے حاکم اپنی رعایا کے ساتھ ایسا ہی کر رہے ہیں۔ رعایا اور حاکم میں تضاد، ہوا اور اڑتے ہوئے پتوں میں بھی تضاد پایا جاتا ہے۔ ان تمام کیفیات کے یک جا ہو جانے سے جو رعنائی شعر کو میسر آئی ہے وہ آپ کے سامنے ہے اور آپ ہی اپنی مثال ہے۔

اسی طرح علامات و استعارات کے استعمال نے ان کی فکری صلاحیتوں کو فنی صلاحیتوں سے ہم کنار کر کے ادب کی دنیا میں نمایاں کر دیا ہے۔ وہ اپنی فکر کو دنیا کے حساس پہلو سے ہم آہنگ کرتے ہیں اور پھر فنی صلاحیتوں سے نکھار کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ شعر قاری کے دل سے چھو جاتا ہے۔ اس رنگ میں رچا بسا ان کا ایک شعر پیشِ خدمت ہے:

درد بھی موج کی مانند سفر کرتے ہیں
اچھا رہتا ہے پلک پر کوئی تارا ہونا

.....

''تارا'' کا استعارہ آنسو کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ شعر کی فکری ترسیل کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ اسی شعر کے پہلے مصرع میں درد کو موج سے تشبیہ دی گئی ہے۔ گویا شاعر نے ہر ممکن کوشش سے شعر کو کامیابی سے نکھار عطا کر دیا ہے۔

علامات کے حوالے سے بھی بات ہوئی تھی تو ہم جانتے ہیں کہ علامات تو ہمارے دور و نزدیک قدم قدم پر بکھری پڑی ہیں۔ صرف ہمیں انھیں چن کر استعمال کرنا ہے۔ استعمال کرنے کے لیے فکری مواد بھی ہمارے اردگرد موجود ہے۔ بس اندازِ بیاں اور طریقۂ استعمال درکار ہے۔ جس سے خالد احمد بخوبی آگاہ ہیں۔ اپنی اس بات کے ثبوت کے طور پر میں ان کا ایک شعر آپ کی نذر کرتا ہوں:

شیشے کے انسان
پتھر کا سنسنار

لیجیے اس قدر مختصر بحر میں علامات کے بل بوتے پر انھوں کس قدر بڑی بات کیجیے۔ یقیناً یہ تو ادراک کا معاملہ ہے اور اختیار و قدرت شعری پر دال ہے۔ اس سے ہمیں ان کے فکر و فن کا اندازہ بھی ہو رہا ہے اور اسلوبِ بیاں کا بھی۔

علامات کے تضاد سے صنعتِ تضاد کے استعمال سے محظوظ ہونے کے لیے بھی ''پہلی صدا پرندے کی'' کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ خالد احمد علامات کے تضاد سے صنعتِ تضاد برتی اور مفہوم کی ترسیل اور شعر کے ابلاغ کو وسعت بخشی۔ لفظوں کے موزوں تر در و بست سے شعر کو وہ حسن بخشا کہ شعرِ اردو ادب میں اپنا منفرد مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ایسے اشعار میں سے ایک شعر آپ کی نذر:

رات کا کذب، مجھے صدقِ سحر لگتا ہے
میں نے یوں شہرِ چراغاں کبھی دیکھا ہی نہ تھا

.....

اس شعر میں رات کا کذب اور صدقِ سحر باہم دو طرح سے متضاد ہیں اور اس دہرے علاماتی تضاد سے شعر کے ابلاغ کو نکھارا گیا ہے اور ترسیلِ فکر کو رواں و بااثر بنا دیا گیا ہے۔ صنعتوں کے استعمال کی بات چلی ہے اور ہم یہ جانتے ہیں اردو ادب میں تلمیحات کے حوالے سے بہت عمدہ اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں لیکن بات دراصل یہ ہے کہ اگرچہ تلمیحات تو وہی ہیں لیکن انھیں نئے اندازِ بیاں سے جدیدیت کا روپ بخشا جاتا ہے۔ اس معاملے میں خالد احمد نے بھی خاصی محنت کی۔ صنعتِ تلمیح کے حوالے سے ان کا ایک شعر:

اے چشم! زلیخا کو بازار دکھا دے
گلیوں میں پھر اک چاک گریبان کا دن ہے

.....

لو جی زلیخا کی تلمیح استعمال کر کے شاعر نے نئے زمانے کے یوسف کے فروخت کیے جانے کے تمام معاملات کو ایسا ابلاغ فراہم کر دیا ہے کہ بازارِ مصر کی ساری داستان نگاہوں کے سامنے گھوم گئی اور شاعر نے شعر لفظ ''پھر'' استعمال کر کے عصرِ رواں کا واقعہ بیان کر دیا ہے۔

اسی طرح صنعتِ جمع کے حوالے سے بھی ان کی جدت طرازی اپنی جولانیوں پر دکھائی دیتی ہے۔ وہ شعر اس لیے کہتے ہیں کہ انھیں پیغام کی ترسیل کرنا ہوتی ہے۔ اور وہ راز سے اچھی طرح آشنا ہیں کہ کس پیغام کے لیے کون سے الفاظ اور کون سی صنعت درکار ہے۔ بس جس فکر کی ترسیل درکار ہوتی

ہے موزوں الفاظ کا در و بست اپنے معیار کے عروج پر دکھائی دیتا ہے۔ گویا شعر کو ہر طرح کی موزونیت سے آراستہ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ اس رنگ میں رچا ہوا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

خاک ، خاشاک ، خار ، خس خالد
انتظارِ نمو میں رہتے ہیں

.....

علامات حسنِ شعر کی افزونی کا عمدہ ذریعہ ہیں۔ ایسے میں اگر علامات کے علاوہ کوئی صنعت وقوع پزیر ہو تو حسنِ شعر مزید نکھر جاتا ہے اور اگر علامت کے ساتھ صنعتِ تضاد کا تڑکا ہو تو لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ آیئے اس لطف کا عملی مشاہدہ کرتے ہیں۔

کس اوج پہ تکریم ہے معزول سروں کی
وہ بارِ تنزل بھی اُٹھانے نہیں دیتے

.....

ادبی دنیا میں ایسے اشعار نایاب نہ بھی ہوں کم یاب ضرور ہیں۔ اوج اور تنزل کے تضاد میں ''معزول سروں کی تکریم'' کی علامات آ جانے سے فکر کی ترسیل کا چاشنی عجب ہے۔ بات علامات کی ہو رہی ہے تو ذرا ان علامات کا جائزہ لیجیے کیسی کیسی علامتیں ہمیں عرضِ ہنر میں میسر ہیں:

ورد کے چاند کاں ڈھلتے ہیں
ہجر کا چاند گہن کیوں دیکھے

.....

ورد کا چاند اور ہجر کا چاند گرہن دو اچھوتی علامتیں ایک ہی شعر میں موجود ہیں ان کی وجہ سے شعر میں فکر کی ترسیل بھی وسیع تر ہو گئی ہے۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جنھیں ہم عصر نقاد نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس بے اعتنائی کا شکوہ خالد احمد اسی غزل کے مطلع میں کیا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ مطلع میں بھی خوب صورت اور دل کش علامات کے ذریعے فکر کو قوتِ ترسیل بخشی گئی ہے۔ مطلع ملاحظہ فرمائیے:

خوبیاں ناقدِ فن کیوں دیکھے
دشت کی آنکھ ، چمن کیوں دیکھے

لوگ مبہوت کھڑے ہیں سرِ بازارِ رضا
اے خدائوت کی انٹی مری قیمت کر دے

.....

لیجیے قیمت تو سوت کی انٹی تلمیح استعمال ہوئی ہے لیکن یہاں بازار مصر کا نہیں ہے بلکہ بازارِ رضا ہے جس نے لوگوں کو مبہوت کر دیا ہے۔ یقیناً ایسی باتیں رضائے الٰہی میں ڈوبے بغیر کر لینا ناممکن کے قریب تر ہے۔ خالد احمد کی یہ خوبیاں عصرِ حاضر کے تبصرہ نگار کو اس کا معترف بناتی چلی جاتی ہیں۔ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے قدیم و جدید علوم کا غائر مطالعہ کیا پھر اس ملغوبے کو اپنے بیانیہ انداز کا تڑکا لگا کر اس پر علامات و استعارات کے ورق لگا کر زمانے کے سامنے پیش کر کے اپنی الگ آواز تسلیم کرائی۔ اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے اپنا منفرد وجود تسلیم کرایا۔ انھیں یارِ رفتگان چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ انھیں انسانیت کے بیتے ہوئے سنہری لمحات مسلسل یاد آتے ہیں تو موجود و خود

غرضی کے لمحات سے اس کا دل دکھنے اور خون کھولنے لگتا ہے تو اس عالم میں وہ اپنی مخصوص علامتوں میں بول اُٹھتے ہیں:

شہر تھا کہ صحرا تھا ، شور ایک جیسا تھا
اک طرف صدائیں تھیں، اک طرف خموشی تھی

.....

وہ عالمِ موجود میں بھی عرصہء رفتہ جیسی بے فکری اور باہمی محبت کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں- وہ جانتے ہیں لمحہء موجود کی مصنوعی سج دھج فقط صناعی ہے یعنی ریت کی دیوار ہے ایسی دیوار جو بادِ حقائق کا ایک جھونکا بھی نہ سہار سکے گی- وہ چاہتا ہے کہ لوگ دنیا میں حقائق سے بھری سادگی سے بھی زندگی بسر کریں اور یہی تو لوگوں کے رب کی رضا ہے جس پر انسانوں کو عمل پیرا ہونے کی تلقین کی گئی ہے-

جس شعر سے خالد احمد کے کلیات کا نام تجویز کیا گیا- یہ شعر ان کی کتاب ''پہلی صدا پرندے کی'' کی ایک غزل کا مقطع ہے- جس میں وہ اپنے جذبات واحساسات کے اشعار میں ڈھلنے کے عمل کی نقاب کشائی کرتے ہیں- اس شعر کو پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ شاعر کی اندرونی دنیا پر جب بیرونی دنیا کے معاملات اثرانداز ہوتے ہیں تو اس کی کیفیت دروں کیا جاتی جاتی ہے اور ان احساسات کو وہ اپنے اندر کی دنیا سے کس طرح اظہار تک لاتا ہے- اس سارے عمل کو شاعر کی زبانی جانتے ہیں-

مل گئے خاک میں آنسو خالد
منزلِ عرضِ ہنر تک پہنچے

یعنی اس کے جذبات و احساسات اس کی کیفیتِ دروں کی حدت سے ان کے دل کے قرع میں کھولنے لگتے ہیں اور بخارات سازی کا عمل وقوع پزیر ہونے لگتا ہے تو شاعر کا دماغ انبیق کا کردار سرانجام دینے لگتا ہے تو آنکھیں انبیق کی نلی کا فریضہ سرانجام دینے لگتی ہیں- جذبات واحساسات کے عرق کے روپ میں وہ اپنے اشعار کشید کرنے لگتا ہے- بات واضح ہوئی کہ اس قدر جاں گزا مراحل سے گزرنا پڑتا ہے تب جا کر جذبات واحساسات اشعار کے روپ میں ڈھلتے پھر اپنی ہستی کو خاک میں ملانا پڑتا ہے- اشکوں سے آب یاری ہوتی ہے- پھر زمینِ ادب پر فصلِ سخن لہلہانے لگتی ہے- تب جا کر شاعر اس منزل پر پہنچتا ہے-

غالب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُن کے کلام میں موجود فکری گہرائی کو سمجھنے کے لیے قاری کو اپنی سوچ اور فہم کو حرکت میں لانا پڑتا ہے- خالد احمد کے کلام میں روایتی کلاسیکی انداز کے شعر موجود ہیں لیکن اُن کی تعداد بہت کم ہے- وہ شعر کے روایتی نظام کی ترتیب سے ایسے اشعار تخلیق کرتے ہیں جو پڑھنے والے سے بھی ہوش وحواس کا تقاضا کرتے ہیں- ایسے اشعار سے اُس وقت لطف اُٹھایا جاسکتا ہے جب قاری اپنے دل کے ساتھ ساتھ اپنے دماغ کو بھی بروئے کار لائے- ورنہ خالد احمد قاری سے اور قاری خالد احمد سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں- خالد احمد کی شاعری، سنجیدہ اور

Committed قاری کا تقاضا کرتی ہے- خالد احمد کی شاعری کی پرتیں، اُس وقت کھلتی ہیں جب قاری خالد احمد کی غزل کے ساتھ ساتھ چلے:

وقت کے ساتھ تقاضوں کو بدل جانا تھا
مجھ کو اے صبحِ ستم! شام کو ڈھل جانا تھا

.....

کوئی تو روئے لپٹ کر جوان لاشوں سے
اسی لیے تو وہ بیٹوں کو مائیں دیتا ہے

اک پل میں بکھرنے کو ہیں سو آئینہ خانے
روکی نہ اگر وقت کی رفتار کسی نے

.....

دل بھر آئے تو سمندر نہیں دیکھے جاتے
عکس، پانی میں اُتر کر نہیں دیکھے جاتے

.....

خالد احمد ہمیشہ سے روایتی تنقید کے زاویوں اور اندازِ فکر کے خلاف تھے- یہ بات بھی سچ ہے کہ ادبی گروہ بندیوں اور ستائشِ باہمی کے اندازِ تنقید نے اردو ادب کو بہت نقصان پہنچایا ہے- خالد احمد تخلیقیت کے حسن کو تنقید سے بہت ارفع و اعلیٰ سمجھتے ہیں:

خوبیاں ناقدِ فن کیوں دیکھے
دشت کی آنکھ چمن کیوں دیکھے

.....

جس کی ہر بات میں صناعی ہو
وہ یہ بے ساختہ پن کیوں دیکھے

.....

ناسپاسوں میں باوقار نہ بن
اے مری بے وقار گویائی!

.....

ناقدوں نے مجھے پرکھا خالد
خاک صحراؤں نے چھانی میری

.....

خالد احمد کی غزل میں اُن کے باطنی اور ظاہری رخوں کی ترجمانی ملتی ہے- جب وہ زندگی کے ظاہری پہلو سے غیر مطمئن ہوتے ہیں تو اپنی روحانی شخصیت میں پناہ لے لیتے ہیں- اس وقت اُن کی تخلیقی حسیات سامنے آتی ہیں اور پھر خالد احمد کے اندر ایک اور خالد احمد گفتگو کرتا سنائی دیتا ہے- جہاں وہ اپنے ضمیر کا بھی کڑا حساب کرتے دکھائی دیتے ہیں:

عمر بھر الجھا ہے مجھ سے
کیسا جھگڑالو مجھ میں

.....

گاؤں پہنچ کر دم لے گا
اِک شہری بابو مجھ میں

.....

وہ کھیت، وہ کھلیان، وہ آنگن، وہ منڈیریں
اِک قریۂ ویراں کہ پسِ گرد سفر ہے

.....

الگ جہاں سے تھے، لیکن جہاں کے ساتھ رہے
غبار ہو کے بھی ہم، کارواں کے ساتھ رہے

.....

خواب میں خواب کی تعبیر بتا دے مجھ کو
اے مرے آج! مرے کل کا پتا دے مجھ کو

خالد احمد کے ہاں ہوسِ زر کا موضوع بھی مختلف صورتوں میں ملتا ہے- زر پرستی اور ظاہر داری کے رجحان کی اس زندگی کو دیکھ کر خالد احمد جیسے فن کار شاعر کے دل میں بھی بے زاری نمودار ہوتی ہے- اس احساس کو انھوں نے اپنی شاعری میں خوبصورتی سے بیان کیا ہے:

زر والوں کے ساتھ ہی خالد، بے زر بھی اُٹھ جاتے ہیں
ماہ و سال گزر جاتے ہیں، ایک گھڑی بچ جاتی ہے

خالد احمد کی غزل میں کیفیتوں کے مختلف رنگ موجود ہیں- کہیں خود کلامی کا تاثر اُبھرتا ہے تو کہیں سرگوشی کا عالم ہوتا ہے- خالد احمد کے ہاں بیسویں صدی کے سائنسی معاشرے سے جنم لینے والے نفسیاتی اضطراب کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے- ان کی غزل، ایک حقیقی تخلیق کار، دانشور، عصری شعور اور تاریخی آگہی سے جنم لینے والے فکر اور حسیات کا فن کارانہ اظہار ہے- مختلف لہجوں کی آواز، کمال خوبصورتی کے ساتھ ان کے لہجے میں مدغم ہوتی دکھائی دیتی ہے- جو روایت کے تسلسل میں پروئے ہونے کے باوجود منفرد ہے:

دل اگر کلیسا ہے، غم شبیہِ عیسیٰ ہے
پھول راہبہ بن کر، روح نے بکھیرے ہیں

.....

خالد احمد فنی ہنرمندی، فنی اثر پذیری اور گہرائی کے اس حد تک قائل ہیں کہ ہنرمند ہاتھ کپاس کے تار کو جس کی نرمی اور ملائمت مثالی ہے کو کانچ کی کاٹ میں ڈھال سکتے ہیں:

یہ کس کا دیدار ہوا
آئینہ گُل نار ہوا

.....

دستِ ہنر کی کاٹ تلے
کانچ کپاس کا تار ہوا

.....

فکرِ فنکار کی ضربوں کے نشاں ہیں اس پر
ایک پتھر فقط اس بات پہ شہکار ہوا

شاعری صرف ریاضت اور مشقت سے عبارت نہیں بلکہ یہ ایک خداداد صلاحیت ہے- اللہ تعالیٰ جس پر مہربان ہو جائے اُسے لفظ کی حرمت و طاقت عطا فرماتا ہے اور پھر شاعر کی ادنیٰ محنت پر اُسے اس درجہ پر پہنچا دیتا ہے:

کچھ بھی کہنے کو نہ مانگا خالد
بات کہنے کا ہنر مانگ لیا

.....

خیال و حرف کی تزئین دیکھنا خالد
کیا ہے کس نے یہ کارِ نگیں، یہ مَیں تو نہیں

.....

خالد احمد کی غزل میں روایت سے ہٹ کر چلنے کا احساس نمایاں ہے- یہ طرزِ اظہار، خالصتاً خالد احمد کا طرزِ اظہار ہے- خالد احمد اپنے اظہار کے لیے، اپنے آپ پر انحصار کرتے ہیں اور تجربات و مشاہدات کے مواقف ایسے الفاظ کا چناؤ کرتے ہیں جو غزل کے ایمائی پہلوؤں کو نمایاں تر کر دیتے ہیں- کہیں کہیں خالد احمد کی غزل میں ایسے الفاظ بھی نظر آتے ہیں جو عام قاری کے لیے، غیر مانوس ہوتے

ہیں- اس کی وجہ خالد احمد کی علمی لغت ہے، جو وسیع المطالعہ ہونے کے سبب آئی:

قیدی کوئی نہ وقت سے پہلے رہا ہوا
لمحہ بھی ، اپنے عصر کے زندانیوں میں تھا

.....

آنکھیں پانی کا گھر ٹھہریں
دریا چڑھ کر دل تک آیا

.....

خالد احمد کی شاعری اپنے طرزِ احساس اور طرزِ اظہار ہر دو صورتوں میں جدت کی حامل ہے- خالد احمد کا کلام فنی پختگی کا منہ بولتا ثبوت ہے- وہ علمِ عروض کے ساتھ ساتھ لفظوں کے اندر چھپی ہوئی معنویت کے سارے اسرار سے بخوبی آگاہ ہیں- یہی وجہ ہے کہ اُن کا کلام جدت بیان کے باوجود معنی آفرینی کا حسن لیے ہوئے ہے:

کیسی میٹھی مہک محبت تھی
شعر ، فن خطِ کاری ہے

.....

آئنہ ہو گئے اشارے بھی
کاروبارِ کنایہ جاری ہے

.....

چاند نکلا تو ستاروں نے پہرے باندھ لیے
خوف آیا مجھے خورشید کی تنہائی سے

.....

جناب حمید نسیم لکھتے ہیں:

"ان کی غزل احساس اور لفظیات، ہر دو سطح پر جدید غزل ہے- انھیں اپنی کلاسیک روایت کا پورا علم ہے جسے وہ حاضر شعوری کی سرحد پر رکھ کر چوکس وجدان سے شعر کہتے ہیں تو بات بہت خوبصورت بھی ہوتی ہے اور عام جدید غزل کی طرح مانوس بھی نہیں لگتی-" (22)

کون لکیروں کو تصویروں میں ڈھالے
کس کا لہو یہ خاکے ، یہ نیرنگ بھرے

.....

رنگِ لباس کو رنگِ بدن سے آب ملے
گنگ حروف میں نغموں کا آہنگ بھرے
کس کی تعلیم کا ، آخری سال تھا
چوڑیاں بک گئیں بالیاں رہ گئیں

.....

ہر لفظ کے ہاتھوں میں تھی اک نرم سی دستک
کہنے کو تو خالی تھے مرے شعر اثر سے

.....

خالد احمد کو قدرت کی جانب سے ایسی آنکھ عطا ہوئی جو ظاہری منظروں کو تہہ تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھی- خالد احمد نے گردی بازار دیکھ کر اپنی دکانِ فن نہیں سجائی بلکہ انفرادیت، معیار اور فکر کو راہ نما بنایا اور اسی لیے وہ اپنے ہم عصر شاعروں سے بہت منفرد اور کمال درجہ انتہا تک پہنچے ہوئے شاعر نظر آتے ہیں- خالد احمد کی غزل میں روایتی غزل یا مشاعرے کے لیے لکھی جانے والی غزلوں کا احساس نہ ہونے کے برابر ہے:

فقط بیانِ حقیقت نہیں ہے منزلِ حق
جہت شناس وہ ہے جو جہت نما بھی تو ہو

پار کیا خوب آگہی کا سمندر ہے
دامنِ صد چاک بادبان رہا ہے

☆☆☆☆☆

خالد احمد فن اور شخصیت

زمین کو پھول فضا کو گھٹائیں دیتا ہے
مجھے فلک سے وہ اب تک صدائیں دیتا ہے
کوئی تو روئے لپٹ کر جوان لاشوں سے
اسی لیے تو وہ بیٹوں کو مائیں دیتا ہے

.....

خالد احمد ہمہ جہت ادبی صفات شخصیت کے مالک خوبصورت شاعر تھے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے وہ اپنے ہم عصروں میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے اور اپنے جونیئرز کے لیے سراپا شفقت اور محبت تھے انھوں نے اپنی تمام عمر لکھنے لکھانے میں گزار دی وہ نوجوانوں کی رہنمائی کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے وہ نوجوان شعرا اور ادیبوں کے لیے ایک ادارے سے زیادہ کام کرتے رہے، جس میں ان کی تربیت اور رہنمائی کا کام کیا جاتا تھا اسی لیے آج تک ادیب اور شعراء ان کو اپنے دل سے بھلا نہیں سکے جہاں بھی لاہور کے شعر و سخن کی بات چلی اُن کو لازماً یاد کیا گیا۔ وہ بیک وقت شاعر، نقاد، مترجم، صحافی، کالم نگار، گیت نگار اور ڈرامہ نویس تھے لیکن شاعری ان کا خاص میدان رہا وہ نعت غزل اور پابند نظم کے باکمال شاعر تھے اور ان اصناف میں ان کے تخلیقی جواہر کھل کر سامنے آئے۔ الفاظ کی نشست و برخاست، مضمون آفرینی، مصرعہ کی بُنت، تلازمہ کاری، علامتوں اور رعایتوں کے معاملات پر انھیں دسترس حاصل تھی یہی وجہ ہے کہ اُن کے کئی اشعار زبانِ زدِ عام ہوئے اور ضرب المثال کی حیثیت اختیار کر گئے..... جیسا کہ:

ترکِ تعلقات پہ رویا نہ تُو نہ میں
لیکن یہ کیا کہ چین سے سویا نہ تُو نہ میں
نوحے فصیلِ ضبط سے اُونچے نہ ہو سکے
کھل کر دیارِ سنگ میں رویا نہ تُو نہ میں

.....

خالد احمد دکھ کی حدّت اور درد کی شدت کو

فیصل زمان چشتی

قلب و جان سے محسوس کرتے تھے اور ان کو اپنے احساس کی بھٹی میں کندن بنا کر احساسات و جذبات سے آراستہ کر کے شعر نکالتے تھے جو سیدھا دل میں پیوست ہو جانے کی صلاحیت کے حامل ہوتے تھے کیونکہ جذبات و احساس اور کیفیت میں کہا ہوا شعر اپنے اندر ایک تلاطم رکھتا ہے جو پڑھنے اور سننے والے کی حسیات پر چھا جانے کی صلاحیت سے مزین ہوتا ہے۔ اُن کے اندر بھی ہمیشہ فکر و احساس اور جذبات و کیفیات کا ایک سمندر موجزن رہا جس میں مدوجزر کی سی کیفیت رہتی تھی اور شعر و سخن کا ایک خوبصورت اور منفرد سلسلہ رواں رہتا تھا۔

اپنے دل کا حال نہ کہنا کیسا لگتا ہے
تم کو اپنا چپ چپ رہنا کیسا لگتا ہے
دکھ کی بوندیں کیا تم کو بھی کھاتی رہتی ہیں
آہستہ آہستہ اپنا ڈھہنا کیسا لگتا ہے
درد بھری راتیں جس دم ہلکورے دیتی ہیں
دریاؤں کے رُخ پر بہنا کیسا لگتا ہے

.....

دو اشعار دیکھیے:

دل بھر آئے تو سمندر نہیں دیکھے جاتے
عکس پانی میں اُتر کر نہیں دیکھے جاتے
اپنے ہاتھوں میں لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
دردمندوں کے مقدر نہیں دیکھے جاتے

.....

ان کی شاعری میں استعارات تشبیہات، تراکیب، فکری رجحان، لہجے کی دلکشی انداز و بیان کی رعنائی، شعور و فکر کی گہرائی، رفعتِ خیال اور مصرعوں کی ترتیب کا سحر انگیز اور دلنشیں انتظام ان کے اشعار کو شعور و سخن کی بلندیوں پر فائز کرتا ہے:

ایک زمانہ ان کی شاعرانہ عظمتوں کا معترف ہے۔ اُن کے دوست اُن کی محبتوں کے اسیر تھے۔ ان کے شاگرد اور عقیدت مند ان کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ہوتے تھے۔ وہ محبتیں بکھیرتے قہقہے لگاتے چاہتیں سمیٹتے علم و آگہی کے سبق پڑھاتے حمد و نعت گنگناتے تہذیب و انسانیت سکھاتے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے مگر ان کا کام ہم کو ہمیشہ ان کے موجود ہونے کی گواہی دیتا رہے گا۔ کیونکہ جسم کو فنا ہے مگر علم و عمل کو نہیں۔ اور وہ علم و عمل کے ایسے چراغ جلا گئے جو اُن کی ہستی کو ہمیشہ منور رکھیں گے۔

پاک ٹی ہاؤس اور پھر الحمرا ادبی بیٹھک ان کی محبت کی خوشبوؤں سے ابھی تک مہکتے نظر آتے ہیں۔ خالد احمد ایک بزلہ سنج انسان تھے اور لاہور کی ادبی محفلوں کی جان تھے ایک وقت تھا کہ لاہور کی کوئی بھی ادبی محفل ان کے بغیر نامکمل ہوتی تھی اس کے ساتھ ساتھ وہ ادبی حلقوں کی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور ہمہ وقت متحرک رہتے تھے۔ لکشمی چوک کے

الفضل ہوٹل میں ان کی نشستیں بھلائی نہیں جاسکتیں جو کم و بیش تیس برس تک جاری رہیں۔ وہ نئے شعرا کی تربیت اور حوصلہ افزائی پر خاص توجہ دیتے تھے۔

اُن کی کامل رہنمائی کرتے تھے اور اُن کی خوداعتمادی میں اضافہ کرتے تھے۔ خالد احمد یقیناً ایک چھتنار تھے اور اُن کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد نجانے کتنے لکھنے والے اُن کی شفقت بھری چھاؤں سے محروم ہو گئے۔ وہ ایک قادر الکلام اور اُستاد شاعر تھے اور شاعری کے تمام رموز پر انھیں دسترس حاصل تھی یہی وجہ تھی کہ پورے ملک بلکہ بیرونِ ملک سے بھی تشنگانِ ادب ان کے پاس حاضری دینے کو اعزاز تصور کرتے۔ ممتاز شاعر نجیب احمد کے ساتھ اُن کا دو مثالی دوستانہ تھا۔ جو کئی عشروں پر محیط تھا، جہاں خالد احمد ہوتے وہاں نجیب احمد ہر صورت موجود ہوتے۔ اور اُن کی ادبی جوڑی کو ابھی تک مثال کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ خالد احمد نعت کے بہترین شاعر تھے اور عشقِ رسولؐ اور مودّت و محبتِ رسول ان کی طبیعت میں شامل تھی یہی وجہ ہے کہ اُن کو ایسی ایسی نعت عطا ہوئی جو ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسا امتیاز ہے جو کہ قابلِ فخر بھی ہے اور اُن کا درِ رسول سے نسبت کا اظہار بھی ہے۔ اشعار دیکھیے:

تو نے ہر شخص کی تقدیر میں عزت لکھی
آخری خطبے کی صورت میں وصیت لکھی
حُسنِ آخر نے کیا حُسن کو آخر تجھ پر
آخری روپ دیا، آخری صورت لکھی
خالد احمد تری نسبت سے ہے خالد احمد
تو نے پاتال کی قسمت میں بھی رفعت لکھی

.....

وہ جدید طرز و اسلوب و احساس کے عظیم شاعر تھے وہ روایت کے ساتھ جدت کو لے کر چلنے کے حامی تھے۔ اور اس کے امتزاج کے حق میں تھے۔ انھیں شعریت کا بھرپور ادراک تھا۔ اُن کی شاعری ابلاغ کی شاعری ہے اور ابہام سے مبرا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر شخص اُن کی کہی ہوئی بات کو سمجھ لیتا ہے شگفتگی اور سلاست اُن کی شاعری کا ایک اور بڑا وصف ہے۔ اُن کے مصرعوں کی بُنت کاری کا رنگ و آہنگ اپنی مثال آپ ہے۔ وہ معاشرے کی زبوں حالی، دگرگوں ہوتے ہوئے حالات اور رشتوں کے تقدس کی پامالی پر دکھی رہتے تھے۔ اور معاشرے میں تہذیب اور روایات کے کمزور پڑنے پر پریشان بھی دکھائی دیتے تھے۔

وہ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کا پوری طرح ادراک رکھتے تھے۔ خود حساس تھے اس لیے سماجی رویوں کی تبدیلی اور لوگوں کی کج ادائیوں پر مغموم بھی ہوئے تھے اُنھیں بدلتے ہوئے آسمان اور پھیکے پڑتے ہوئے رنگوں کا پوری شدت سے

احساس تھا وہ چاہتے تھے کہ آپس میں تعلقات اور محبتوں کی قوسِ قزح اُسی طرح اپنے رنگ بکھیرتی رہے۔ باغوں میں جھولے پڑے رہیں اور چمن میں بہار کے دن مدام رہیں لیکن جو کچھ چاہا جائے ویسا پورا کب ہوتا ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں:

بات سے بات نکلنے کے وسیلے نہ رہے
لب رسیلے نہ رہے نین نشیلے نہ رہے
پھول سے باس جدا فکر ہے احساس جدا
فرد بھی ٹوٹ گئے، فرد قبیلے نہ رہے
موت نے چھین لیا رنگ بھی نم بھی خالد
آنکھ بھی سوکھ گئی ہونٹ بھی نیلے نہ رہے

.....

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

خاک پر خاک کی ڈھیریاں رہ گئیں
آدمی اُٹھ گئے نیکیاں رہ گئیں
کس کی تعلیم کا آخری سال تھا
چوڑیاں بک گئیں بالیاں رہ گئیں
درد انگور کی بیل تھے پھل گئے
غم کشوں کے لیے تلخیاں رہ گئیں

.....

خالد احمد بیک وقت اردو، پنجابی، فارسی، عربی، ہندی اور عبرانی، زبانوں پر مہارت اور عبور رکھتے تھے اُن کے شعری مجموعوں میں تشہیب، ایک مٹھی ہوا، ہتھیلیوں پہ چراغ، پہلی پوپھلی پروائی، دراز پلکوں کے سائے سائے اور نم گرفتہ شامل ہیں۔ انھوں نے پاکستان ٹیلی وژن اور ریڈیو پاکستان کے لیے بے شمار نغمات تحریر کیے۔ پی ٹی وی کے لیے بھی بے شمار ڈرامے لکھے، جن میں کاجل گھر، کہانی اور قاسمی کہانی ڈرامہ رقیب یادگار ہیں۔ وہ لحہ لحہ کے نام سے مختلف اخبارات میں کالم بھی لکھتے رہے اور رسالہ فنون میں بین السطور کے نام سے بھی لکھتے تھے۔ 2009 میں ان کی بے پناہ علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے انھیں پرائیڈ آف پرفارمنس سے بھی نوازا۔

خالد احمد بے پناہ تخلیقی قوتوں کے مالک تھے اُن کو ہم سے جدا ہوئے تقریباً دس سال کا عرصہ ہونے کو آیا ہے مگر وہ اپنے کام اور تخلیقات کے باعث ہمارے درمیان ہمیشہ زندہ و جاوید رہیں گے۔

آخر میں اُن کے کچھ اشعار کے ساتھ اجازت چاہوں گا:

دم سادھ کے دیکھوں تجھے جھپکوں نہ، پلک بھی
آنکھوں میں سمولوں ترے لہجے کی دھنک بھی
اے عشق! اگر مجھ کو ترا اذن ہو ممکن
آغوش میں لے لوں تیرے پیکر کی مہک بھی
دھوپ کی ریت، تنہائی کی، ویرانی کی
ہم نے اک عمر ترے غم کی نگہبانی کی
ہم نے اس سال بھی جی بھر کے نہ دیکھا تجھ کو
خالد اس سال بھی ہم نے وہی نادانی کی

☆☆☆☆☆

ٹریفک پھنس گئی ہے

وہ چہرہ اجنبی تھا
سخن میں بے رُخی تھی
نظر میں آسمانی بے حسی تھی
مگر وہ نام کتنا آشنا تھا
مجھے آہستہ آہستہ بہت کچھ یاد آتا جا رہا تھا

خزاں کے رنگ پھیکے پڑ رہے ہیں
کہ پتے زندگی کے بوجھ سے تنگ آ چکے ہیں
ہوا، دَل بادلوں کا روپ دھارے
جادو دانی آسمانی رنگ گہنانے لگی ہے
سنہری زرد پتے آخری سانسوں کے بَل پر
رُتوں سے آخری رَن میں جتے ہیں
یہ کیسا معرکہ سَر کر رہے ہیں
ہوا کے رُخ گھسلتے پھر رہے ہیں
ہوا یخ بستہ آہیں بھر رہی ہے
زمیں پتوں سے باہیں بھر رہی ہے
کہ باہوں میں کراہیں بھر رہی ہے
ہوا، پازیب میں پتے پروئے پھر رہی ہے
مگر تہذیب کی پازیب میں فولاد کی کالی کمک ہے
ابھی اس مہ لقا کی چال کے سنگ،
آتش و آہن کے توڑوں کی کھنک ہے
فقط گہری سیاہی بچ رہی ہے
اک آتش بان، آتش دانِ دل میں

وہ گیلی لکڑیاں سُلگا رہا تھا
جنھیں آنکھوں سے کوسوں دُور پَل پَل
برستے آنسوؤں نے تر رکھا تھا
مرا سینہ دُھوئیں سے بھر گیا تھا
ٹریفک پھنس رہی تھی

وہ اتنی خوب رُو تھی
کہ مجھ کو جاگتی آنکھوں کا سپنا لگ رہی تھی
اب ایسے خواب صرف آسودہ آنکھیں دیکھتی ہیں
تہی دستی جنھیں تعبیر سے نا آشنا آنکھوں میں
رقصاں آرزو کے رنگ کہہ دے
کہ یہ زَر رَنگ، زَر اَندام سپنے
صرف زَر اندوز آنکھوں کے لیے ہیں
وہ مجھ کو چاہتی تھی
مگر میں اپنی تنہائی کے جھلمل آئنے پر
دلِ رُسوا کی خبریں سُن رہا تھا
ہتھیلی کے بیاباں کی ہوا میں خاک ہوتی
بہت تنہا، مگر رُسوا لکیریں چن رہا تھا
وہ کیا دن تھے کہ مجھ سا عام لڑکا
بہت سی لڑکیوں سے آشنا تھا
مگر میں عام سا لڑکا تھا، مجھ میں جاذبیّت کی کمی تھی
مری آنکھیں چمکتی تھیں
مگر ان کی چمک کا کوئی مستقبل نہیں تھا
وہ مجھ کو جانتی تھیں
میں اُن کو جانتا تھا
ذہانت، نم نوائی، پارسائی

دیارِ رنگ کے سکّے نہیں تھے
انھیں معلوم تھا، یہ قیمتی ہیں
مگر یہ قیمتی سکّے کسی ٹکسال پر چلتے نہیں ہیں
یہ اِک تاریخ رکھتے ہیں، مگر تاریخ کیا ہے؟
شکستہ کاغذوں میں دفن لمحے
خمیدہ مقبروں پر ایستادہ،
زوال آمادہ محرابی جھروکے
پریدہ رنگ مرمر
پریدہ رنگ کاغذ
پریدہ رنگ سکّے
ذہانت، نم نوائی، پارسائی
دیارِ رنگ کے سکّے نہیں ہیں
یہ سکّے پابجولاں ہیں، یہ چلنا بھول بیٹھے ہیں
اَب اِن کا کوئی مستقبل نہیں ہے
ٹریفک پھنس گئی تھی

وہ سبز آنکھیں، وہ گہرے سرخ ڈورے
سنہری بال شانوں پر بکھیرے
وہ لالہ رنگ تن پر
سیہ ساڑھی لپیٹے
زمیں پر پاؤں رکھتی،
مگر نقشِ کفِ پا ارضِ دل پر چھوڑ جاتی
وہ سبز آنکھیں، سیہ پلکیں
سیہ پلکوں سے چھنتی سبز آنکھیں
نئے جذبوں کی چھب دکھلا رہی تھیں

''ہم اِس ٹک شاپ میں کب تک یونہی بیٹھے رہیں گے؟
''ذہانت رہن رکھ کر کیا ملے گا؟
''محبت پیٹ بھر سکتی ہے؟ بولو!
''کسی کی پارسائی کب کسی کے کام آئی؟
''یہ دِلِ پارسائی رہن رکھ دو! اور دیکھو!
''یہ تم دن بھر ہتھیلی کی لکیریں کس کی دُھن میں چھانتے ہو؟
''ہتھیلی کی لکیروں میں یہ کس کو ڈھونڈتے ہو؟
''مجھے بتلاؤ! آخر اِن لکیروں میں بھلا کیا کھو گیا ہے؟
''محبت؟
''محبت کیا ہے؟ شورِ نارسائی، محض شورِ نارسائی!
''یہ غزلیں اور نظمیں
''ڈرامے اور کالم
''ڈراما ہیں، ڈراما
''ڈراما چھوڑ دو، پلکیں اٹھاؤ
دیارِ رنگ میں سیلِ بلا آیا ہوا ہے!''
وہ کانوں کی لووں تک جل اٹھی تھی
سو، پُروائی دھواں دینے لگی تھی
وہ کتنی مختلف سی لگ رہی تھی
وہ یک سر اجنبی بھی لگ رہی تھی
عجب بے اعتنائی رُوبرو تھی
یہ کیسی بے کسی تھی
نہ جانے کیا؟ وہ کہنا چاہتی تھی
ٹریفک پھنس گئی تھی
نہ جانے کیا؟ وہ کہتی جا رہی تھی
رگِ جاں تک اُترتی جا رہی تھی
مگر نس نس بکھرتی جا رہی تھی

وہ میری دوست تھی، شاعری تھی
وہ گھر بھر میں چہکتی پھر رہی تھی
وہ دیدہ زیب پیراہن کے پیچھے
مری نظروں سے چھپتی پھر رہی تھی
مری آنکھیں پروں کے رنگ میں اُلجھی ہوئی تھیں
نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی تھی؟
ٹریفک پھنس گئی تھی

میں اک نا آشنا بستی کے نامانوس رستے پر کھڑا تھا
زمیں پر دوڑتی شفاف سڑکیں
ہوا میں تیرتی صد رنگ، یک رفتار، بے آواز کاریں
یہ ناہموار دنیا، کس قدر ہموار رَو تھی
یہ دوڑ، اک نیم خوابی کی فضا میں
بڑے زوروں سے آگے بڑھ رہی تھی
بظاہر دوڑ جاری تھی،
یہ دوڑ، اب اختتامی مرحلے میں تھی
مگر نا مختتم تھی

یہ دنیا ریزہ ریزہ تھی مگر نا منقسم تھی
سڑک پر ایک آوازوں کا جنگل
محل کی سمت بڑھتا آ رہا تھا
ٹریفک پھنس گئی تھی

کہاں تک ہارن ہکلاتے رہیں گے
رَم و رفتار دہلاتے رہیں گے
سڑک کس موڑ تک سیدھی چلے گی؟
کہ یہ، یک رنگ یکسانی اب اُکتانے لگی ہے

یہ کھچڑی بال، یہ چہرے کی شکنیں،
لرزتے ہاتھ، تیلی اور ماچس
یہ پل پل کپکپاتے ہونٹ، سگریٹ
یہ برساتی ہواؤں کے تھپیڑے
ٹھٹھرتی زندگی پگ پگ گھسٹتی جا رہی ہے
میں بوڑھا ہو گیا ہوں!
ٹریفک پھنس گئی ہے!

مری دنیا میں ایسا شور کب تھا؟
مجھے تنہائی نے دہلا دیا ہے
میں بوڑھا ہو گیا ہوں،
تم جواں ہو
مجھے دھکے نہ دو،
میں گر پڑوں گا
یہ قالینی سڑک میرا لہو بھی چاٹ لے گی
میں بوڑھا ہو گیا ہوں!
مجھے عزت نہ دو، آنکھیں چرا لو
فقط تیور بدل کر دیکھ لو، پیچھا چھڑا لو
جسد کا گھر لحد ہے
دل اپنے گھر کا رستہ بھول بیٹھا
یہ نیلا آسماں، یہ آسماں چھونے پر آمادہ عمارات
یہ سر در آسماں سنگیں عمارات
خمیدہ مقبروں، بوسیدہ محرابی جھروکوں کے لیے پردہ سرا ہیں
پسِ مژگاں چمکتی نیلگوں شفاف آنکھیں کس قدر سفاک ہیں
اے جاں! دل اپنے گھر کا رستہ بھول بیٹھے
ٹریفک پھنس گئی تھی

خالد احمد

وہ چہرہ اجنبی تھا
سخن میں بے رخی تھی
نظر میں آسمانی بے حسی تھی
مگر وہ نام کتنا آشنا تھا؟
مجھے آہستہ آہستہ بہت کچھ یاد آتا جا رہا تھا
مرے ماضی کے قبرستان میں محشر بپا تھا
کہیں زیرِ زمیں تابوت چٹخے جا رہے تھے
کئی قبریں، گڑے مُردے اُگلنے پر مصر تھیں
کئی مدفون یادیں
کفن سَرکا رہی تھیں
مگر دل سے نبرد آرائی میں حاصل مہارت
اِس اعصابی تحارب میں مرے کام آ رہی تھی
وہ مجھ کو چاہتی تھی
تمدُّن کی سنہری چار دیواری کے پیچھے
وہ پتھریلی فصیلوں کا تحفظ چاہتی تھی
مگر اِس چار دیواری کے پیچھے
فقط تنہائی، میری ہم قفس تھی
ٹریفک پھنس گئی تھی

وہ سبز آنکھیں تو کب کی اپنے گھر کی ہو چکی ہیں
سو، اب یوں ہے کہ میں اِس عمر میں بھی
اِسی ٹک شاپ پر بیٹھا ہوا ہوں
نہ جانے کس کا رستہ دیکھتا ہوں
کوئی آ جائے، میرا بِل چکا دے
یہ بارِ جاں، یہ قرضِ دل چکا دے
ٹریفک پھنس گئی ہے!

غزل

کس کو چھو کر ماہتابی ہو گیا
جھیل کا پانی شہابی ہو گیا

شام لہروں میں کھلی کِس رنگ کی
یہ کنارہ بھی گلابی ہو گیا

اے مرے افکار کی پس ماندگی
اک زمانہ انقلابی ہو گیا

ٹھوڑیوں تک گردنوں میں طوق ہیں
رنگِ دنیا احتسابی ہو گیا

پیروی کی کِس نے اک اک رسم کی
عشق تک کِس کا نصابی ہو گیا

حادثوں نے کر دیا شاعر مجھے
کام یہ بھی اکتسابی ہو گیا

آدمی کیا عکس تک پتھرا گئے
آئینہ شہر خرابی ہو گیا

گھٹتے گھٹتے میں کتابِ عشق میں
ایک سطر انتسابی ہو گیا

خالد احمد

غزل

بام و فلک اُجاڑ کر رکھ دیے کھیل کھیل میں
میرے پَر اُس نے جھاڑ کر رکھ دیے کھیل کھیل میں

دشتِ سخن اُجڑ گیا، قیس کا بن اُجڑ گیا
میرے خط اُس نے پھاڑ کر رکھ دیے کھیل کھیل میں

یار تھے وہ کہ غیر تھے، اُس کو بتانِ دیر تھے
خیر سے زندہ گاڑ کر رکھ دیے کھیل کھیل میں

میں نے بھی کلکِ یار سے، کام لیے کٹار کے
زخم سبھی بگاڑ کر رکھ دیے کھیل کھیل میں

کب وہ اسے پسند تھے، پیڑ کہ سر بلند تھے
جڑ سے وہ سب اکھاڑ کر رکھ دیے کھیل کھیل میں

جام و صراحی و سبو، نشۂ مستِ آرزو
زُہد نے توڑ تاڑ کر رکھ دیے کھیل کھیل میں

کچھ ہدفِ نگاہ تھے، کچھ ہدفِ مزاح تھے
اس نے تو سب لتاڑ کر رکھ دیے کھیل کھیل میں

کلک کی ہر کلیل پر، ہاتھ گیا غلیل پر
پنکھ سب اس نے جھاڑ کر رکھ دیے کھیل کھیل میں

رعبِ جمالِ یار نے، یار کے چوب دار نے
شیر ژیاں پچھاڑ کر رکھ دیے کھیل کھیل میں

رکھ لیے غم بھی نوچ کے، جان و جسد کھرونچ کے
اس نے تو دل اُجاڑ کر رکھ دیے کھیل کھیل میں

یار کس آن بان سے، گزرے تھے اپنی جان سے
مُردے گڑے، اُکھاڑ کر رکھ دیے کھیل کھیل میں

خالد احمد

مستنصر تارڑ اور بھگت سنگھ کی شخصیت سازی

غافر شہزاد

مستنصر حسین تارڑ کا پنجابی ناول ''میں بھناں دلی دے کنگرے'' چالیس سال پہلے شایع ہونے والے ناول '' پکھیرو'' کے بعد شایع ہوا ہے۔ ''میں بھناں دلی دے کنگرے'' کئی حوالوں سے اہم ناول قرار دیا جاسکتا ہے۔اس ناول میں بھگت سنگھ کی شخصیت سازی پر نظر ثانی کی گئی ہے۔ناول پڑھنے کے بعد ایک اور بھگت سنگھ کا ہیولا ذہن میں ابھرتا ہے۔اس سے پہلے بھگت سنگھ پنجابیوں کا ہیرو تھا اور اس کو آزادی کا نقیب و حریت پسند قرار دیا جاتا تھا کہ جسے بغاوت کے جرم کی پاداش میں انگریزی عہد میں پھانسی دے دی گئی تھی۔ تاریخ کی کتابوں میں واقعہ کی تفصیلات اس حوالے سے موجود نہیں ہیں کہ بھگت سنگھ کی شخصیت سازی کے ان عوامل کی جانب اشارہ کریں کہ جن کے تحت بھگت سنگھ کو یہ حتمی قدم اٹھانا پڑا اور تختہ دار پر ہنسی خوشی چڑھنے کی روایت قائم کی۔اس بات پر کبھی بحث نہیں کی گئی کہ آخر گاندھی نے بھگت سنگھ کی حمایت کیوں نہیں کی؟ صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ گاندھی تشدد کے بجائے وہ عدم تشدد کا حامی تھا۔ بھگت سنگھ روسی انقلاب سے متاثر تھا، مارکسزم اس نے گھول کر پیا ہوا تھا اور وہ روسی انقلاب کی بنیادوں پر ہی کالج کے اس گروپ میں شامل ہو گیا تھا جو اشتراکی سوچ

رکھتے تھے۔ اشتراکی سوچ کی تقلید میں ہی وہ پھانسی چڑھا تھا اور اس نے مطالبہ کیا تھا کہ اسے بھی فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کیا جائے۔ پنجاب یا پنجابی زبان سے اسے کوئی محبت نہیں تھی، اس نے خط کتابت بھی اردو میں کی اور اردو کے اشعار ہی کوٹ کرتا تھا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ وہ پنجاب میں سکھ گھرانے میں پیدا ہوا مگر اس کے دونوں دوسرے ساتھی سکھ دیو اور راج گرو ہندو تھے اور لالہ لجپت رائے کہ جس کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے اس نے انگریز آفیسر کو گولیوں کا نشانہ بنایا تھا، وہ بھی ہندو تھا۔

بھگت سنگھ لائلپور کے ایک قصبے بنگہ کا رہنے والا اور لاہور کے نیشنل کالج کا طالب علم تھا، آزادی کے راستے کا مسافر تھا۔ اس کی شخصیت سازی میں مارکسزم کا اس وقت کا فلسفہ پوری طرح عمل پیرا تھا۔ اس نے نہایت تفصیل سے ایک عام آدمی کے تحفظ، خوشحالی اور حقوق کے لیے مارکسزم کا مطالعہ کیا اور پھر سیاسی طور پر سرگرم ہو گیا۔ اس کا والد بھی تحریک آزادی کا نہایت سرگرم رکن تھا اور کئی بار جیل جا چکا تھا یہاں تک کہ جب بھگت سنگھ پیدا ہوا، تب بھی اس کا والد جیل میں تھا۔ تارڑ صاحب ناول میں بھگت سنگھ کی شخصیت سازی میں اس وقت کے ماحول اور حالات کا تذکرہ کرتے ہیں جن میں رہتے ہوئے بھگت سنگھ رہ رہا تھا۔

بھگت سنگھ کا متحرک کردار اس وقت سامنے آتا ہے جب ایک ہندو لالہ لجپت رائے کو سائمن کمشن کی شرائط کے خلاف جلوس نکالنے کے دوران میں لاٹھی چارج سے زخمی کر دیا جاتا ہے یہاں تک کہ ہسپتال پہنچ کر وہ مر جاتا ہے۔ یہ واقعہ نوجوانوں کو انگریزی عہد کے خلاف اکسانے کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے۔ لالہ لجپت رائے کے بدلے میں بھگت سنگھ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر پولیس آفیسر سکاٹ کو قتل کرنے کا منصوبہ بناتا ہے۔ اس کے لیے وہ موقع کا جائزہ لیتے ہیں اور سکاٹ کو قتل کرنے کے لیے پوری طرح منصوبہ بندی کرتے ہیں، مگر غلطی یہ ہو جاتی ہے کہ سکاٹ کی جگہ ایک دوسرا انگریز پولیس والا ساؤنڈرس گولیوں کا نشانہ بن جاتا ہے۔ قتل کی واردات کے بعد بھگت سنگھ اپنے دوستوں کے ساتھ روپوش ہو جاتا ہے۔ کسی کو علم بھی نہیں ہوتا کہ کون لوگ تھے جنھوں نے ساؤنڈرس کو گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔

یہاں مستنصر حسین تارڑ بھگت سنگھ کی جانب سے دو دلائل دیتے ہیں: پہلا یہ کہ بہرے کو بات سنانے کے لیے لازم ہے کہ چیخا جائے اور اس کی صورت یہ ہے کہیں بم بلاسٹ کیا جائے۔ دوسری وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص کو قتل کرنے کے مقابلے میں ایک سوچ کو قتل کرنا زیادہ اہم ہے۔ اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ پارلیمنٹ ہاؤس میں بم بلاسٹ کو منصوبہ بناتے ہیں۔ بم ایسے

انداز سے چھوڑا جاتا ہے کہ جہاں کوئی جانی نقصان نہ ہو۔ دوسرا فیصلہ یہ کرتے ہیں کہ وہ گرفتاری دے کر عدالت میں اپنا موقف زیادہ زوردار طریقے سے بیان کریں گے تا کہ اس کی بازگشت چہار عالم جائے اور سب سنیں۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ گرفتاری کے بعد بھگت سنگھ کا توانا کردار اور موثر انداز سے سامنے آتا ہے۔ وہ عدالت میں اعتراف کرتے ہیں، انکار نہیں کرتے جس کی وجہ سے انہیں سزائے موت ہو جاتی ہے۔ بھگت سنگھ کا والد سزائے موت کو عمر قید میں بدلنے کے لیے اعلیٰ عدالت میں معافی نامہ لکھ کر دیتا ہے جس پر بھگت سنگھ شدید ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ دوسری جانب وہ عدالت میں احتجاج کرتا ہے کہ وہ جرائم پیشہ نہیں، حریت پسند ہیں، اس لیے انہیں فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کر کے گولیوں کا نشانہ بنایا جائے۔ تارڑ صاحب کی بھگت سنگھ کی شخصیت سازی کے حوالے سے یہ دلیل کافی وزنی قرار پاتی ہے۔

بھگت سنگھ جتنا عرصہ جیل میں رہتا ہے، ایک بے خوف اور نڈر حریت پسند کے طور پر اپنا وقار قائم رکھتا ہے۔ وہ پڑھنے کے لیے دنیا کے فلسفے، تاریخ، سیاسیات، شاعری، ڈرامہ، فکشن، ادبی رسائل منگواتا ہے۔ اسے برٹرینڈرسل پسند ہے۔ وہ اس کی کتاب ''وہائی مین فائٹ''، اور دیگر کتابوں میں ملٹرازم، اور کمیونزم لیفٹ ونگ کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ آخر دم تک حریت پسندوں کی طرح خود کو قائم رکھتا ہے اور خوشی خوشی پھانسی کے پھندے پر جھول جاتا ہے۔

ناول کے آخری حصے میں بھگت سنگھ اور اس کے دو ہندو دوستوں کو پھانسی دینے کے بعد ان کے جسموں کے ٹکڑے کر دیے جاتے ہیں۔ پھانسی کے پھندے کی طرف جاتے ہوئے بھگت سنگھ کے ہاتھ میں لینن کی کتاب تھی اور وہ اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ مل کر رام پرشاد بسمل کا یہ شعر پڑھ رہا تھا:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

.....

مستنصر حسین تارڑ کا یہ ایک تاریخی ناول ہے مگر ساتھ ساتھ فکشن بھی ہے۔ تاریخ کو فکشن کا درجہ کیسے دینا ہے، اس بارے تارڑ صاحب خوب جانتے ہیں۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ تاریخ ایک مخصوص تناظر میں لکھائی جاتی ہے، یہ کبھی سچ نہیں ہوتا۔ اس لیے تاریخ سے یہ مطالبہ کرنا ہی بے معنی ہو جاتا ہے کہ اس میں سچ ہو۔ اگر تاریخ میں فکشن کی طرح کچھ ایسا شامل ہوتا ہے جو سچ نہیں ہوتا تو پھر ایسے فکشن کو تاریخ بنانے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔

ایک بات تو ناول پڑھنے کے بعد ہمارے سامنے کھل کر سامنے آتی ہے کہ ناول میں جیسے واقعات اور ماحول کی عکاسی کی گئی ہے، اس کی موجودگی اور مدد کے ساتھ بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کے کردار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور جو کچھ وہ کہتے ہیں، جو کچھ وہ

کرتے ہیں اس پر یقین کر لینے کو دل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناول میں مستنصر حسین تارڑ بھگت سنگھ کی شخصیت سازی میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

بادشاہوں اور حکمرانوں کی لکھوائی ہوئی تاریخ کے متوازی ہمیشہ ایک تاریخ کی ضرورت رہتی ہے۔ وہ یہی تاریخ ہے۔ اس میں بھگت سنگھ کے کردار کو نسیم حجازی کے ناولوں کی طرح رومانٹیسائز نہیں کیا جاتا اور قاری کی دلچسپی کے لیے کوئی مرچ مسالہ بھی شامل نہیں کیا گیا۔ یہ حقیقی تاریخ ہے، حقیقی منظر نامہ ہے، بالکل سچ نہ سہی مگر ایسا ہی کچھ ہوا ہوگا، اس پر یقین کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ الگ بات کہ ہمیں تاریخ کی نصابی کتابوں میں علامہ اقبال کا مسلمانوں کے لیے الگ وطن کا خواب پڑھایا جاتا ہے اور محمد علی جناح کو اس خواب کی عملی صورت میں لانے کا کریڈٹ دیا جاتا ہے مگر یہ سرکاری تاریخ ہے، زمینی حقائق اس سے کچھ مختلف رہے ہیں۔ بھگت سنگھ کے پھانسی چڑھنے تک ہندو، سکھ، مسلمان سبھی آزادی کی جنگ انگریزوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ یہ ایک محاذ پر متحد ہو کر انگریزوں کے خلاف صف آرا تھے، اگر 1947 میں پاکستان کی تشکیل ہوئی تو اس میں کہیں نہ کہیں بھگت سنگھ کے سے حریت پسندوں کا ضرور حصہ رہا ہوگا، یہ کہنا تھا مستنصر حسین تارڑ کا۔ یہ تو 1930 کے بعد کی بات ہے جب مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں کو علاحدہ انتظامی یونٹ بنانے کے بارے میں تحریک کا آغاز ہوا۔ اس سے پہلے ہندو مسلمان اور سکھ اکٹھے آزادی کی لڑائی میں شامل تھے۔ یہ متوازی تاریخ نصابی کتب میں کبھی نہیں پڑھائی گئی۔ گاندھی نے پارلیمنٹ میں بھگت سنگھ کے قدم کی مخالفت کی تھی جب کہ قائد اعظم نے اس کی حمایت کرتے ہوئے چھ صفحات کی لمبی تقریر کی تھی جس میں کہا گیا کہ ان محرکات پر ضرور غور کرنا چاہیے کہ جن کی وجہ سے نوجوانوں کو ایسے انتہائی اقدامات اٹھانے پڑتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کا یہ ناول لکھنا بھی اتنا ہی دلیرانہ ہے جتنا دلیرانہ قدم بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے اپنی آزادی کے لیے اٹھایا تھا۔ پورے ناول میں ایک کتا بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے جس پر بھگت سنگھ اپنے دوستوں کی نسبت زیادہ اعتماد کرتا تھا، اس لیے کہ اس کے دوستوں نے اس سے بے وفائی کی تھی اور وہ وعدہ معاف گواہ بن گئے تھے۔ کتے کو اس لیے بھی وہ ساتھ لیے پھرتا ہے کہ بلھے شاہ کے بقول ''کتے، مینوں اتے''۔ یہ ناول پنجاب کے کلچر اور رہتل کی ایک شاندار پیش کش ہے۔ آزادی کی تحریک کی اصل روح اور ہندستان کی آزادی کی تحریک کے جملہ عوامل کو اگر سمجھنا ہو تو یہ ناول اس کی بھرپور اور موثر معاونت کرتا ہے۔

کو اگر سمجھنا ہو تو یہ ناول اس کی بھرپور اور موثر معاونت کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

ارتکاز، ایک ذمہ دارانہ تنقیدی اظہار

معاصر شعرا کے بارے میں کم لکھا جاتا ہے- اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نقاد مخالفت مول نہیں لینا چاہتا ہے- اگر کچھ لکھتا بھی ہے تو زیادہ تر توصیفی ہوتا ہے- وہ حسن و قبح کے اعلیٰ معیارات سامنے رکھ کر تخلیقات کا جائزہ لینے کے بجائے مصلحت کا شکار ہو جاتا ہے- ''ارتکاز'' میں معاصر شعرا کی شاعری پر مضامین شامل ہیں- یہ کتاب دو اعتبار سے اہم ہے- پہلا یہ کہ انھوں نے شعرا کا کڑا انتخاب کیا ہے اور بجا طور پر وہ تنقیدی جائزے کے مستحق ہیں- دوسرا یہ کہ انھوں نے انتہائی عمدگی سے شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے بے لاگ رائے کے ساتھ ساتھ مشرقی و مغربی نقادوں کے حوالے بھی درج کیے گئے ہیں- ان کا طرز اظہار معاصر تنقیدی اظہار کا پرتو نہیں ہے- انھوں نے موجودہ تھیوری کھیلنے والے نقادوں سے متاثر ہونے کے بجائے تاثراتی اور تجزیاتی اسلوب اپنایا ہے- یوں اپنے اسلوب کی بنا پر وہ الطاف حسین حالی کے قریب دکھائی دیتے ہیں- کتاب میں شامل پہلا مضمون بھی حالی کی غزل پر لکھا گیا ہے- باقی تمام مضامین معاصر شعرا یا ان کے شعری مجموعوں پر ہیں- جن میں شاید ایک دو کے سوا انھیں تمام شعرا سے براہِ راست ملاقات کا موقع ملا ہے- ان میں منیر نیازی، توصیف تبسم، رامین چند بانی، احمد مشتاق، خورشید رضوی، خالد احمد، نجیب احمد، اعجاز گل، صابر ظفر، ممتاز اطہر، غلام حسین ساجد، شفیق سلیمی، محسن اسرار،

شاہد اشرف

خالد علیم اور اشرف سلیم شامل ہیں۔ معاصر شاعری کے تناظر میں یہ کتاب بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ اہل ادب کو اس کتاب کا کشادہ دلی اور کھلے بازوؤں سے استقبال کرنا چاہیے۔۔

اس کتاب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ نوید صادق نے جن شخصیات پر مضامین تحریر کیے ہیں انھیں عمومی تنقیدی جائزوں میں نظر انداز کیا گیا ہے۔ ہمارے نقاد نظم و غزل کے باب میں چند نمایاں شعرا کے علاوہ دیگر شعرا کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ نصاب بھی قرار دی جا سکتی ہے۔ یہ کتاب نصاب سے قطع نظر ان منطقوں کی دریافت کا پیش خیمہ ہے جو اہل نقد کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں مگر انھیں توجہ نہیں ملی ہے۔ پہلا مضمون حالی کی غزل پر لکھا گیا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ حالی کا اولین تعارف شاعری ہے مگر نصاب میں حالی سوانح نگار اور نقاد کی حیثیت سے زیر بحث آتے ہیں۔ بحیثیت شاعر انھیں مکمل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ مسدس حالی بھی قصہ پارینہ ہو گئی ہے۔ وہ مضمون ''سرسری نہیں دل کی واردات'' میں لکھتے ہیں:

''حالی کی غزل لائق مطالعہ و قابل ستائش رہی ہے اور رہے گی۔ اگرچہ میں نے اس مقالہ میں حالی کی غزل میں صرف اس حصے کو موضوع بنایا ہے جسے عاشقی سے تعلق ہے کیوں کہ ہمارے ہاں اس موضوع کی عدم موجودگی اور عدم دلچسپی کو بنیاد بنا کر ہمارے بعض جدید تنقید نگاروں نے حالی کو نیچا ہی دکھایا ہے۔ جب کہ حالی کی شاعری بالخصوص غزل میں جہاں کلاسیکی شعریت کا پرکشش اجال نظر آتا ہے وہاں ان کی حیثیت ایک مجتہد کے طور پر ضرور دکھائی دیتی ہے جس نے جدید شاعری اور نئی غزل کا راستہ استوار کیا۔''

حالی کے علاوہ تمام مضامین معاصر ادبا پر لکھے گئے ہیں۔ یہ عمومی تاثر ہے کہ ادیب آئندہ زمانے کے لیے لکھتا ہے اور اپنے عہد سے آگے دیکھتا ہے۔ بحیثیت نقاد نوید صادق نے آئندہ شعری منظر نامہ تشکیل دے دیا ہے۔ اس میں مزید اضافے کی گنجائش کے باوجود کسی شاعر کو فکری و فنی اعتبار سے منہا کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ کتاب اس امر کی نشان دہی بھی کرتی ہے کہ کچھ شعرا کو محض زندہ ہونے کی سزا کے طور پر پذیرائی سے محروم رکھا گیا ہے اور ان کی موت کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں گزشتہ دور کے کئی شعرا کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ اہل وطن کے ہاں سنگ زنی اور اعزاز سے دفنانے کی روایت اب بھی موجود ہے۔

نوید صادق کی تنقیدی زبان شستہ اور غیر مبہم ہے۔ وہ آسانی اور روانی سے اظہار پر قدرت رکھتے ہیں۔ وہ گہرا شعری شعور رکھتے ہیں اور شعری موضوعات کی تہ در تہ پرتیں کھولنے کا ہنر جانتے ہیں۔ انھیں جدید و

قدیم اسلوب سے مکمل آگاہی بھی حاصل ہے۔ کئی شعرا کے مضامین میں ذاتی تعلقات کی تفصیلات درج ہیں۔ یوں شعر اور شخصیت کو جاننے میں مدد ملتی ہے۔ انھوں نے شعروں کا انتخاب کرتے ہوئے حد درجہ احتیاط سے کام لیا ہے۔ اس انتخاب میں مجھے کہیں بھی کمزور شعر نہیں ملا ہے۔ شعر شخصیت کا آئینہ بھی ہوتا ہے اور اس کے ذریعے شاعر کے باطن کو سمجھا جا سکتا ہے۔ یوں شعر محض شعر نہیں رہتا ہے بلکہ شاعر کے نفسیاتی تجزیے کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ مضمون ''احمد مشتاق کو سمجھنے کی پہلی کوشش'' میں لکھتے ہیں:

'' شاعر کے باطن میں ایک جھجک ہے۔ اسے احساس شکست یا انکسار کا نام بھی دیا جا سکتا ہے اور یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کے اندر ایک خوف ہے۔ معاشرتی خوف۔ وہ چاہتا ہے کہ ہر کام بالا ہی بالا ہو جائے، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ اور تو اور محبوب بھی اس بات سے بے خبر رہے تو اچھا ہے۔ اس میں اپنی ذات سے گریز کا ایک پہلو بھی نکلتا ہے اور خود اذیتی کی ایک دبی دبی خواہش بھی۔ یہی رویہ عشق میں اس کی ناکامرانیوں کا باعث بنتا ہے۔''

وہ غزل کے فنی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں۔ فن کی باریکیوں سے آگاہ ہیں اور اس باب میں اسلوب، ہیئت اور تکنیک کے مسائل کا جائزہ بھی لیتے ہیں۔ البتہ انھوں نے خیال کو فوقیت دی ہے اور ممکنہ حد تک فکری پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ انھوں نے مغرب سے مستعار تنقیدی اصطلاحات سے تحریر کو متاثر کن بنانے کی شعوری کوشش نہیں کی۔ مجھے جا بجا ان کی تنقید پر تخلیق کا گمان ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ خود بھی بہت اچھے شاعر ہیں۔ جب کوئی شاعر تنقید لکھتا ہے تو از خود اس میں تخلیقی عنصر نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب بیک وقت تنقید و تخلیق کا عمدہ نمونہ ہے۔ بعض شعروں کی تعبیر و تشریح شعروں کے حسن سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ میں انتہائی ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ نوید صادق کا پیرایہ اظہار حد درجہ خوبصورت اور شاندار ہے۔ میں اپنے مضمون کا اختتام کتاب میں شامل چیخوف کے ایک اقتباس سے کرنا چاہتا ہوں۔

'' ادب نہ سماجی تربیتی ادارہ ہے اور نہ پارٹی آفس، نہ تو یہ کھیلنڈروں کی تفریح گاہ ہے، نہ تھکے ماندوں کی پناہ گاہ، ادب ایک ایسا نگار خانہ ہے جس کی رونق ان تصویروں سے ہے جو انسانی زندگی کے تجربات کا بیان ہوتی ہیں۔ اس لیے فن کار کی دلچسپیاں جتنی رنگا رنگ اور ہمہ گیر ہوں گی، اتنا ہی اس کا فن جان دار اور متنوع خصوصیات سے تاب ناک ہوگا۔''

☆☆☆☆☆

تمھیں اپنا بنانا ہے

''تمھیں اپنا بنانا ہے'' ریاض ندیم نیازی کی غزلوں کا مجموعہ ہے جس میں چند نظمیں بھی شامل ہیں۔ اس سے قبل اُن کے پانچ نعتیہ، ایک حمدیہ، دو مناقب وسلام اور دو غزلوں کے مجموعے شائع ہو کر اہلِ علم وادب سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں اور مقبولِ عام بھی ہیں۔ معروف شاعر و ادیب، محقق، اسکالر، کالم نگار ڈاکٹر انور سدید کتاب کے بارے لکھتے ہیں کہ تمھیں اپنا بنانا ہے کا مطالعہ کیا تو یوں محسوس ہوا کہ ریاض ندیم نیازی شاعری نہیں کر رہے، پتھروں سے پھول اُگا رہے ہیں۔ ریاض ندیم نیازی کی شاعری بلوچستان کے پہاڑوں سے رونما ہوئی لیکن اس کی خوش بو دیوارِ چمن پار کر گئی اور لاہور تک پہنچی جو دور دراز کے مضافات کے خوش فکر شاعروں کو اپنی حدود میں شامل نہیں ہونے دیتا۔ لاہور نے اِنھیں داد و تحسین سے نوازا ہے تو یہ اِن کی شاعری کا خصوصی اعزاز ہے اور کتاب کے عنوان کی رعایت سے کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے لاہور، کراچی، اسلام آباد اور ملتان کو اپنا بنا لیا ہے۔ بلاشبہ ریاض ندیم نیازی غزل اور نظم میں اپنے احساسات و جذبات رقم کرتے ہیں تو ان کی زندگی کا مطالعہ، واقعات و حادثات پر ان کا ذاتی ردِ عمل ہمارے سامنے آتا ہے ان کی شاعری میں زمانہ پورے سیاق وسباق کے ساتھ ابھرتا ہے اور وہ ہمیں مثبت قدروں کے شاعر نظر آتے ہیں۔ افتخار عارف یوں رقم طراز ہیں کہ ادبی گہما گہمی کے اعتبار سے نسبتاً بڑے شہروں سے دور سبی میں مقیم ریاض ندیم نیازی کی غزلوں کا مجموعہ ''تمھیں اپنا بنانا ہے'' پڑھ رہا ہوں، خوش ہو رہا ہوں اور داد دے رہا ہوں کہ غزل میں کیسے کیسے امکانات ہیں اور کیسے کیسے تازہ نفس اور صاحبِ امکان شعرا اردو کی سب سے مقبول صنف میں اپنے تخلیقی جوہر کا اظہار کر رہے

عبدالمناف خجک

ہیں، صلہ وستائش سے بے نیاز دور اُفتادہ شہر میں آباد اس تازہ دم شاعر کا خیر مقدم کیا جانا چاہیے کہ اس نے اردو کی جدید غزل کی سرحدوں میں قابلِ ذکر اضافہ کیا ہے۔ خالد شریف کہتے ہیں کہ ریاض ندیم نیازی کو میں ایک مشاق نعت گو کی حیثیت سے جانتا تھا مگر اب جو "تمھیں اپنا بنانا ہے" کا مطالعہ کیا تو سچی بات ہے کہ ریاض کی ریاضت نے یہاں بھی قائل کرلیا کہ وہ غزل کے میدان میں بھی کچھ کر گزرنے کا ملکہ رکھتا ہے میں ہمیشہ اس بات پہ یقین رکھتا ہوں کہ معروف ادبی مراکز سے دور بسنے والے خیال وفکر کے اعتبار سے زیادہ تازہ دم ہوتے ہیں۔ ریاض ندیم اس کی ایک روشن مثال ہے۔ ریاض ندیم نیازی خود کہتے ہیں:

ندیم حمد و ثنا میں بھی ہے کمال تجھے
تجھے غزل میں بھی ہم کام یاب دیکھتے ہیں

کتاب کے شروع میں معروف شاعر منیر نیازی اور ڈاکٹر عاصی کرنالی کی طرف سے ریاض ندیم نیازی کے لیے لکھی گئی نظموں کا عکس شامل کیا گیا ہے۔ سحر انصاری اپنے تاثرات میں یوں گویا ہیں ریاض ندیم نیازی اپنی تخلیقی اور تنظیمی صلاحیتوں سے شاعری کی روایت کو آگے بڑھا رہے ہیں ان کے مصرعوں میں برجستگی اور خاص لہجہ ملتا ہے۔ امجد اسلام امجد کہتے ہیں ریاض ندیم نیازی نے زندگی کے وہ رُخ اپنی شاعری میں نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے جو دوسرے انسانوں کے تجربات کا حصہ ہیں۔ ریاض ندیم نیازی نے جو بھی لکھا توجہ اور انہماک سے لکھا۔ نیویارک میں مقیم کراچی سے تعلق رکھنے والے شاعر رفیع الدین راز لکھتے ہیں ریاض ندیم نیازی نے شاعرانہ لفاظی سے گریز کرتے ہوئے ایسے طرزِ فکر سے رشتہ جوڑا ہے جس کا تعلق زندگی کی سچائیوں سے ہے یہ وہ سچائی ہے جو عہد کی ترجمان بھی ہے اور اپنی تہذیب وثقافت کی پہچان بھی - ڈاکٹر اجمل نیازی لکھتے ہیں ریاض ندیم نیازی کی شخصیت میں بے قراریاں اور سرشاریاں یک جا ہوگئی ہیں اور یہ بات کسی کے یکتا ہونے کے لیے کافی ہے۔ مجھے یقین ہے جو بھی ریاض ندیم نیازی کو پڑھے گا وہ اس کا اپنا بن جائے گا۔ شبنم شکیل کہتی ہیں کہ ندیم نیازی کی شاعری کلاسیکیت اور جدت کا خوب صورت امتزاج لیے ہوئے ہے۔ زندگی کے تجربات نے اُسے سکھا دیا ہے کہ غم اور خوشی دونوں لازم وملزوم ہیں۔ ریاض ندیم نیازی کے اس مجموعے کے لیے ایوب خاور، اعتبار ساجد، اور یا مقبول جان عباسی، سید عارف، مجید اصغر، ڈاکٹر قاسم جلال، خورشید بیگ میلسوی، ڈاکٹر اختر ہاشمی، افضل مراد، نوید حیدر ہاشمی، شاعر علی شاعر اور دیگر نے خوب صورت مضامین تحریر کیے ہیں۔

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے ٹلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورنٹل کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

واجد علی شاہ: تیسری شخصیت واجد علی شاہ صاحب تھے۔ ان کی رحیم یار خان میں ٹیکسٹائل مل تھی۔ شاہ صاحب کا خانوادہ برصغیر کے معروف خاندانوں میں سے تھا۔ تقسیم سے قبل بھی یہ ان معدودے چند مسلمانوں میں سے ایک تھے جنہوں نے کارخانے لگا رکھے تھے، نہیں تو یہ کام ہمارے مسلمان بھائیوں نے ہندوؤں پر چھوڑ رکھا تھا۔ شاہ صاحب کو قائداعظم کا سپاہی ہونے پر بھی بڑا ناز تھا اور بطور ثبوت انہوں نے وہ تصویر ڈرائنگ روم میں خاص طور پر لگا رکھی تھی جس میں پاکستان آمد کے وقت یہ قائد کے پیچھے جہاز سے برآمد

ہوتے ہوئے دکھائی دیتے۔
بھاری بھرکم جسم، سرخ و سفید رنگ، ایک مخصوص چمک لئے سرخی مائل آنکھیں، اس وقت ستر سال کے لگ بھگ تھے لیکن جو چیز اُن کی شناخت تھی وہ دولت، خاندانی نجابت نہیں بلکہ بڑی بڑی، بھاری بھاری کھڑی کھڑی دبیز نگڑی مونچھیں تھیں۔ ہو سکتا ہے کچھ علاقوں میں بڑی بے ہنگم مونچھ مضحکہ خیز ہو لیکن پنجاب میں یہ عزت، وقار اور افتخار کی علامت ہے۔ پنجاب میں تین مونچھیں بڑی مشہور تھیں۔ نواب کالاباغ کی مونچھ، قبلہ شاہ کا ''موسٹیش'' اور تیسرے درجے پر جھنگ کے زمیندار مغیث شاہ تھے جن کا حسین چوک کے قریب بہت بڑا امام باڑہ ہے۔ شاہ صاحب ان تین مونچھوں کا تقابل بڑے منفرد انداز میں کیا کرتے تھے۔ کہتے نواب کالاباغ کی مونچھ گورنری کے زور پر کھڑی ہے۔ واجد علی شاہ کی مونچھ پیسے کے زور پر کھڑی ہے۔ میں واحد شخص ہوں جس کی مونچھ اپنے زور پر کھڑی ہے۔
جب بھی شاہ صاحب آتے میں انہیں ضرور ملتا۔ قائد کے ساتھی جو تھے۔ ہم مسلمان بڑے جذباتی اور سادہ لوح قوم ہیں۔ تقسیم سے قبل جس شخص نے عبا یا اس سے ملتا جلتا جھگا بھی پہن رکھا ہوتا تو ہم اس کے ہاتھ چوم چوم کر اسے ہلکان کر دیتے۔ ہر عربی کو ہم نے زہد و تقویٰ کی تصویر سمجھ رکھا تھا۔ ہم نے کبھی بھی یہ جاننے کی کوشش نہ کی کہ یہ لوگ یورپ اور مشرق بعید میں جا کر کیا گل کھلاتے ہیں۔
گو حیات قائد پر ہم نے بہت کچھ پڑھ رکھا تھا لیکن وہی باتیں شاہ صاحب کی زبانی سننے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک کہانی پڑھنا الگ بات ہے اور وہی واقعات کسی داستان گو سے سننے کا اپنا مزہ ہے۔ شاہ صاحب جب بتاتے کہ قائد نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یہ کہا تھا، وہ بات کی تھی واجد یہ بات میں صرف تمہیں بتا رہا ہوں، تو کچھ یوں گمان ہوتا جیسے اس واقعے کے ہم عینی شاہد ہیں۔
شاہ صاحب پاکستان اولمپک کمیٹی کے صدر بھی تھے۔ بطور صدر انہوں نے پاکستان کا بہت نام روشن کیا۔ ایک کے تو ہم عینی گواہ ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں لاس اینجلس کے ایسٹ ایل اے کالج گراؤنڈ میں ہاکی میچ ہوا۔ پاکستان نے جرمنی کو شکست دے کر گولڈ میڈل حاصل کیا۔ خوشی کی ایک لہر تھی جو چار سو دوڑ گئی۔ ہم نے گراؤنڈ میں جا کر بھنگڑا ڈالنے کی کوشش کی لیکن امریکن سیکورٹی کے اہلکاروں نے ہمیں روک دیا۔ خوشی کے اس موقعہ پر شاہ صاحب سوچے سمجھے بغیر گراؤنڈ میں داخل ہو گئے۔ امریکیوں کی ہر اپیل کو انہوں نے رد کر دیا۔ جب انہوں نے زبردستی کرنے کی کوشش کی تو وہ زمین پر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے ''مجھے اُٹھا کر ہی باہر لے جاؤ گے، میں کسی صورت باہر جانے والا نہیں۔

سیکورٹی اہلکاروں نے جب اُن کا ڈیل ڈول دیکھا تو ہاتھ کھڑے کر دئے۔ انہیں اُٹھا کر باہر لے جانا کار دارد تھا۔ ظاہر ہے کہ گراؤنڈ میں ایمرجنسی کرین لانے کا بندوبست نہ ہو سکتا تھا۔

اپنے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے بتانے لگے۔ انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی کو کھیلوں کے انعقاد کے لئے کسی ملک کا انتخاب کرنا تھا۔ سپین بھی اُمیدوار تھا۔ شاہ کارلوس نے مجھے کھانے کی دعوت دی۔ بڑے خوبصورت محل میں رہتا ہے جو دیکھنے کے قابل ہے۔ کھانے کے بعد منت سماجت کرتے ہوئے بولا "میں شاہ سپین ہوں۔ آپ بھی پاکستان کے شاہ ہیں، آلِ رسول ہیں۔ میری صرف اتنی درخواست ہے کہ آپ اپنا ووٹ سپین کو دیں۔" عزیزم! وہ منظر دیکھنے والا تھا۔ کاش میں ان لمحات کو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کر سکتا، تاریخ رقم ہو رہی تھی۔ ایک بہت بڑے ملک کا مطلق العنان حکمران گھگیا رہا تھا، منت سماجت اور ترلوں پر اُتر آیا تھا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے یہ میری نہیں پاکستان کی عزت افزائی ہو رہی ہے۔ میں نے اسے تسلی دی "تم بھی شاہ ہو، میں بھی شاہ ہوں۔ فکر نہ کرو! شاہ ہمیشہ شاہ کا ہی طرفدار ہوتا ہے اور ہم تو روایتاً شاہ کے طرفدار ہی نہیں وفادار بھی ہیں۔ سو میں نے پرچی سپین کے حق میں ڈال دی اور وہ جیت گیا۔

مسکراتے ہوئے بولے "عزیزم! زندگی میں میرا ایک اصول رہا ہے۔ تم بھی نوٹ کر لو۔

Never ride the losing horse

تحفے اور توشہ خانہ: ایک دن دفتر جانے کے لئے گھر سے باہر نکلا تو لان میں بوڑھے برگد کے پیڑ کے نیچے دو قیمتی ریچ روورز کھڑی تھیں۔ پہلے تو سمجھا کہ کوئی شخص ملنے کے لئے آیا ہے اور کیمپ آفس میں بیٹھا ہے۔ استفسار پر ٹیلی فون آپریٹر نے بتایا کہ یہ گاڑیاں ہز ہائی نس نے تحفتاً ڈی سی اور کمشنر کے لئے بھیجی ہیں۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی کیونکہ اس سلسلے میں ظفر اقبال صاحب یا چودھری منیر نے کبھی کوئی اشارہ بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے کمشنر ملک عبدالمجید کو اطلاع دی تو بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے "میں ڈرائیور بھجوا رہا ہوں اس کے ہاتھ گاڑی بھیج دو۔" میں نے انہیں مشورہ دیا کہ اس کی حکومت کو باضابطہ اطلاع دی جائے اور حتمی فیصلہ بھی مرکزی حکومت پر چھوڑ دیا جائے۔ رولز کے تحت جب بھی کسی سرکاری افسر کو باہر سے کوئی تحفہ ملتا ہے تو اس کی نہ صرف حکومت کو اطلاع دی جاتی ہے بلکہ وہ تحفہ بھی توشہ خانے میں بھجوا دیا جاتا ہے۔ وہاں پر اس کی "بک ویلیو" کا تعین کیا جاتا ہے۔ تعین شدہ رقم کا 25% اگر افسر جمع کرا دے تو وہ تحفہ اسے مل جاتا ہے بصورت دیگر وہ بحق سرکار ضبط کر لیا جاتا ہے۔

ملک صاحب گاڑیوں کو اسلام آباد بھیجنے کے خلاف تھے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے لوگ گھاؤ گھپ اور احساسِ مروّت سے یکسر عاری ہیں۔ صوبائی سروس کے افسروں کو تو ویسے ہی ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

گاڑیاں تو انہوں نے کیا واپس کرنی ہیں ہو سکتا ہے اس کو بہانہ بنا کر ہمارے تبادلے کا تحرک کریں۔

ملک صاحب کا خیال سو فیصد درست نکلا۔ گاڑیاں دیکھ کر سٹیبلشمنٹ ڈویژن کے اہلکاروں کی رالیں ٹپکنا شروع ہو گئیں۔ توشہ خانے میں پڑی ہوئی چیزوں کو وہ میراث پدر سمجھ کر جب چاہیں اور جس طرح چاہیں استعمال کرتے ہیں۔

ڈپٹی سیکرٹری نے ایک لمبا چوڑا نوٹ بنا کر سیکرٹری کو بھیجا۔ سیکرٹری نے اس پر سنہری حاشیہ آرائی کرتے ہوئے لکھا کہ اتنے چھوٹے افسروں کا ایک والئی ریاست سے تعلقات قائم کرنا بذات خود قابل اعتراض بات ہے۔ ان دنوں وزیراعظم موجود نہیں تھا۔ عبوری دور تھا۔ فائل غلام اسحاق خان کے پاس گئی جو بنیادی طور پر ایک تنگ نظر بیوروکریٹ تھا۔ اس نے گاڑیاں ضبط کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ اب اسے محض اتفاق سمجھئے کہ اس کے کچھ روز بعد ہی ان نادر اور قیمتی تحفوں کی فہرست اخباروں میں چھپی جو غلام اسحاق خان نے مختلف سربراہان مملکت سے وصول کیے تھے اور جنہیں بغیر ڈکار لئے وہ ہضم کر گیا تھا۔

گاڑیاں تو جانی تھیں، سو چلی گئیں لیکن میری شامت آ گئی۔ کمشنر صاحب مجھے کافی عرصہ تک مطعون کرتے رہے۔ کہتے ''تمہاری وجہ سے بڑا نقصان ہو گیا ہے۔ اوّل نقصان مایہ دوم شماتت ہمسایہ۔ دوسرے کمشنر ہمارا مذاق اُڑا رہے ہیں، بڑے آئے تھے تحفے وصول کرنے والے۔ کہاں ہیں کدھر گئے ہیں وہ تحفے۔ اب میں انہیں کیا جواب دوں؟ تم نے میری جیب میں سوراخ تو کیا ہی تھا اب زبان بندی بھی کرا ڈالی ہے۔''

ناراض وزیر چوہدری حمید گجر کا پیغام آیا کہ ان کے داماد وفاقی وزیر عبدالستار لالیکا رحیم یار خان آئے ہیں اس لئے رات کا کھانا ان کے گھر تناول فرمائیں۔ اگر وہ دعوت نہ بھی دیتے تو پھر بھی ملاقات کے لئے ان کے گھر جانا بنتا تھا۔ کتاب میں لکھا ہے کہ جب بھی کوئی وفاقی یا صوبائی وزیر ضلعی صدر مقام کا دورہ کرے گا تو ڈی سی اور ایس پی اسے ملنے جائیں گے۔ اس کے لئے لفظ Call on استعمال کیا گیا ہے۔ عبدالستار لالیکا محض وزیر ہی نہ تھے بلکہ میاں صاحب کے پنج پیاروں کے بھی راج دلارے تھے۔ انہیں میاں نواز شریف کا نفس ناطقہ بھی کہا جاتا تھا بالکل جس طرح شیخ رشید صاحب ''بازوئے شمشیر زن'' ہونے پر اتراتے تھے۔

کھانے پر لالیکا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ہاتھ ملایا تو اس میں حرارت نہ تھی۔ بڑی بے رُخی اور بے اعتنائی سے ملے۔ کھانے کے دوران بھی سارا عرصہ کمشنر سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ آخر بات کیا ہے۔ چونکہ وہ اپنے سسرال میں تھے اس لئے

ایک اعتبار سے وہ میزبان بھی تھے۔ مہمانوں کے ساتھ اس قدر بے رُخی، بے اعتنائی اور روکھا پن ہماری مشرقی روایات کے بھی خلاف ہے۔ آخر ایسی کون سی گستاخی یا کوتاہی ہوئی ہے جس کا ہمیں سزاوار ٹھہرایا جا رہا تھا۔

کھانا کھا کر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ رسماً ایک بار پھر ہاتھ ملایا تو پھٹ پڑے۔ بولے ''ڈی سی صاحب! آپ کے ضلع میں میرے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔ میں نے اے سی صادق آباد الطاف بھنڈر کو اپنی آمد کی پیشگی اطلاع دی تھی۔ بایں ہمہ وہ مجھے ملنے نہیں آیا، گارڈ کا بھی مناسب بندوبست نہیں تھا۔''

میں نے کہا ''آپ مجھے اطلاع دیتے۔ ہم آپ کو ''ریسیو'' کرتے۔''

بولے ''چونکہ پہلے صادق آباد پہنچنا تھا سوچا اے سی کو براہ راست مطلع کر دوں، وہ بھی ایک طرح سے اپنے سب ڈویژن کا ڈی سی ہی ہوتا ہے'' میں نے انہیں یقین دلایا کہ اے سی کے خلاف مناسب اور فوری کارروائی ہوگی۔

میں نے فون پر اے سی کی جواب طلبی کی تو اس نے اصل صورت حال بتائی۔ کہنے لگا ''آج سے کچھ عرصہ پہلے وہ بہاولنگر میں ان کے علاقے میں اے سی تھا۔ ان سے بڑی دوستی تھی کیونکہ ہم مشرب و ہم نوالہ تھے۔ کسی بات پر ناراضی ہوگئی۔ اب وزیر بن کر مجھے ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے تو ان کا دورہ سرکاری نہیں تھا، فاتحہ خوانی کے لئے رحیم آباد گئے تھے پھر ریسٹ ہاؤس نہیں آئے۔ پیغام دیا کہ اے سی صادق آباد رحیم آباد اور کے ایل پی روڈ کے سنگم پر کھڑا ہو کر میرا استقبال کرے۔ میری سواری کسی وقت بھی وہاں سے گزر سکتی ہے۔ میں بھی گوجرانوالہ کے زمیندار گھرانے سے ہوں۔ نوکری تو چھوڑ سکتا ہوں اس قسم کی تذلیل برداشت نہیں کر سکتا۔''

میں نے کہا ''تم نے بہت اچھا کیا ہے۔ آج کے بعد میرا حکم ہے کہ اس کا کبھی بھی استقبال نہ کرنا۔''

لالیکا صاحب کچھ عرصہ تو معافی نامے کا انتظار کرتے رہے۔ جب مایوس ہوئے تو ایک بار پھر رحیم یار خان کے دورے کا پروگرام بنایا۔ اب کے اے سی کے بجائے مجھے تحریری پیغام بھجوایا کہ اُن کا شایانِ شان استقبال کیا جائے۔ ڈی سی اور ایس پی کنال ریسٹ ہاؤس میں خود حاضر ہوں۔ یہ ہو، وہ ہو، نہیں تو وہ صوبائی حکومت کو لکھ کر شکایت کریں گے۔

عین اس وقت جب ان کی سواری رحیم یار خان میں داخل ہو رہی تھی، میں اور مرزا یاسین شہر سے باہر جا رہے تھے۔ انہوں نے بڑی حیرت سے ہمیں جاتے ہوئے دیکھا۔ انہیں شاید اس بات کا علم نہیں تھا کہ کتاب میں یہ تو لکھا ہے کہ ڈی سی اور ایس پی وزیر

موصوف کو کال آن کریں گے۔ کال آن کا مطلب استقبال نہیں ہوتا، پھر اس میں مزید اضافت یہ تھی کہ If they happen to be in the Distt headquarter (اگر وہ ضلعے میں موجود ہوں تو!) ظاہر ہے کہ ڈی سی جب دورے پر ہو تو اس کے لئے وزیر موصوف کو ملنا ضروری نہیں ہوتا۔ ان کی آمد سے قبل ہی ہم نے لیاقت پور کا دورہ رکھ لیا تھا۔

عقل مند کو اشارہ کافی ہوتا ہے - عام حالات میں شاید شکایت بھی لگا دیتے۔ سن گن تو رکھتے تھے۔ انہیں بتایا گیا کہ شاید دال نہ گل سکے ویسے بھی وہ اپنے سسرال کے لئے وبال نہ بننا چاہتے تھے۔

کچھ دنوں بعد بہاول پور میں وزیر اعلیٰ آئے تو یہ بھی وہاں موجود تھے۔ سرکٹ ہاؤس کے برآمدے میں ان سے ملاقات ہوگئی۔ کہنے لگے ''آپ ناراض ہیں، میں سادات کو ناراض نہیں کرسکتا۔ یہ کہہ کر بغلگیر ہوگئے۔'' میں نے کہا ''لالیکا صاحب! ہم تو درویش منش لوگ ہیں۔ ڈپٹی کمشنری کو اپنے اُوپر کبھی مسلط نہیں کیا۔ خدارا دیکھے تو نہ مارا کریں۔'' وہ ایک تلخ واقعہ ہمیں بہت قریب لے آیا۔

وزیر اعلیٰ کی بہاول نگر آمد: وزیر اعلیٰ نے ایک عمومی حکم دے رکھا تھا کہ جب بھی وہ بہاول پور ڈویژن کا دورہ کریں تو باقی ضلعوں کے ڈی سی وہاں موجود ہوں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ڈویژن کے تمام ممبران اسمبلی بھی وہاں پہنچ جاتے اور اپنے مطالبات اور گزارشات پیش کرتے۔ ڈی سی کی موجودگی میں حکم صادر کرنا آسان ہو جاتا۔ میاں صاحب حکم دینے سے پہلے ڈی سی کی رائے بھی لے لیتے۔

ان دنوں بہاول نگر کا ڈپٹی کمشنر احمد سلیم اکبر تھا۔ تھا تو مہر جیون خان کے بیچ کا لیکن اپنی عادات و خصائل کی وجہ سے ترقی نہ کر پایا تھا۔ جیون خان ایڈیشنل چیف سیکرٹری بن گیا تھا لیکن وہ ہنوز ڈپٹی کمشنری کے مزے لوٹ رہا تھا۔ مگر اسے اس بات کا قطعاً ملال نہ تھا کہ وہ سروس کی دوڑ میں اپنے رفقا سے بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ اس کی بھی چند وجوہ تھیں۔ کافی عرصے سے ڈپٹی کمشنر سے زمین کی صوابدیدی الاٹ منٹ کے اختیارات لے لئے گئے تھے۔ اگر کسی سکیم کے تحت زمین دینی ہوتی تو فائل کو منظوری کے لئے مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا۔ اس سلسلے میں ذرا سی کوتاہی کو بھی بڑی سنجیدگی سے لیا جاتا۔ صفدر کاظمی ڈی سی بہاولپور نے تھوڑی سی غلطی کی تو معطل ہوگیا اور بالآخر اسی غم کو سینے سے لگائے چل بسا۔

احمد سلیم اکبر نے تو انتہا ہی کر دی۔ بہاول نگر بازار کی قیمتی کمرشل زمین ایک سو روپے فی مرلہ کے حساب سے بغیر اجازت اپنی مرضی کے آدمیوں کو دے ڈالی۔ اس پر ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ بورڈ آف ریونیو نے جواب

طلبی کر ڈالی۔ کس کے حکم پر یا کون سے ضابطے کے تحت اس نے زمین بیچی ہے۔ اس پر اس نے اس قدر دلچسپ جواب دیا جو راجہ ٹوڈرمل جیسا زیرک انسان بھی سن لیتا تو عش عش کر اٹھتا۔ اس نے لکھا ''زمین بے کار پڑی تھی۔ صدیق جٹ ایم پی اے نے مجھے حکم نما مشورہ دیا اور میں نے یہ کام کر ڈالا''

زمین کی الاٹ منٹ تو بورڈ نے منسوخ کر دی لیکن ڈی سی بہادر کو نہ تو معطل کیا گیا اور نہ تبدیلی کے احکامات آئے۔ تعلق جو شاہی سروس سے تھا۔ ان دنوں اسد علی شاہ بورڈ کے چیئرمین تھے۔

اس کو تبدیل نہ کرنے کی بظاہر ایک معقول وجہ بھی تھی۔ ڈی سی صاحب نے اپنے ہی ضلعے میں ایک جہازی بنگلہ بنوانا شروع کر دیا اور اس کارخیر میں ہر میونسپل اور ٹاؤن کمیٹی کو حسب حیثیت حصہ ڈالنے کا کہا گیا۔ بات میاں نواز شریف تک پہنچی۔ جب ہم انہیں ملے تو وہ احمد سلیم اکبر سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ''سنا ہے آپ یہاں کوٹھی بنا رہے ہیں۔ حالانکہ آپ رہنے والے لاہور کے ہیں۔'' اس پر وہ فٹ سے بولا ''کوٹھی تو میں آپ کی اجازت سے بنا رہا ہوں''

''وہ کیسے؟'' میاں صاحب بڑے حیران ہوئے۔ کہنے لگا ''کوٹھی تک بجلی کے کھمبوں کی منظوری آپ نے دی تھی۔''

کسی دن اس نے درخواست لکھ کر میاں صاحب سے چپکے سے منظوری لے لی تھی۔ وزیراعلیٰ کے پاس درخواستیں پڑھنے کا کہاں وقت ہوتا ہے۔ ویسے بھی وہ نوے فیصد احکامات زبانی دیا کرتے تھے۔ ان کا سیکرٹری C.M has desired لکھ کر حکم نامہ جاری کر دیتا تھا۔

علاقے کے کچھ مولویوں کے کان میں بھنک پڑ گئی کہ وہ قادیانی ہے۔ انہوں نے اس کے خلاف اخبارات میں ایک بیان جاری کر دیا۔ اس نے سب کو بلا کر پہلے تو سخت ڈانٹ پلائی اور پھر ڈی سی فنڈ سے جو رقم انہیں بطور گرانٹ دی تھی وہ واپس لے لی۔ کسی مولوی کی جیب سے دیا ہوا پیسہ نکلوانے کا غالباً یہ پہلا واقعہ تھا۔

احمد سلیم اکبر نے بڑے عجب شوق پال رکھے تھے۔ درمیانہ قد، دھان پان سا بدن، اڑے اڑے بال اور کھلتا ہوا گندمی رنگ تھا۔ مٹک مٹک کر چلتا۔ مجرد تھا۔ بقول شخصے اسے شادی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ سارے ضلع میں اس کی ایک تگڑے سے حوالدار سے دوستی تھی۔ شام کو جب وہ حوالدار کے ساتھ موٹر سائیکل پر کھیتوں کی سیر کو نکلتے تو بازار کے دکاندار انگلیاں اٹھا کر کہتے ''وہ دیکھو ڈی سی صاحب مہم پر جا رہے ہیں۔''

ایک دفعہ منتھلی میٹنگ پر مجھے ملا تو خاصا پریشان تھا۔ کہنے لگا ''شاہ صاحب میری مدد کرو۔'' پہلے تو میں گھبرا گیا۔ کیا اس کا مچھندر حوالدار سے جھگڑا تو نہیں ہو گیا۔

''فرمایئے؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

کہنے لگا ''مرکزی حکومت نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ میری بالآخر پروموشن کر کے تبادلہ اسلام آباد کر دیا ہے۔ مجھے نہیں چاہئے ایسی ترقی۔ جائنٹ سیکرٹری بھی کوئی پوسٹ ہوتی ہے۔ میں اپنی پروموشن سے دست بردار ہونے کو تیار ہوں۔ میاں صاحب کو کہیں مجھے یہاں ہی رہنے دیں۔ مجھے اس ضلع سے محبت ہوگئی ہے۔ ان کی معروضات میں بڑا وزن تھا۔ بہاولنگر کا وسیع و عریض ضلع، کھلی فضا، تازہ ہوا، انوکھی مہمات۔

کمشنری سے انکار: چیف سیکرٹری کا استدلال ایک اعتبار سے درست تھا۔ میں اس وقت تک گریڈ ۱۸ میں تھا۔ چوبیس سال کی سروس کے بعد بھی جی گریڈ ۱۷ سے ۱۸ میں پہنچ پایا تھا۔ اس میں میرا کوئی دوش نہ تھا۔ سب پی سی ایس افسروں کو ایک ہی چھڑی سے ہانکا جا رہا تھا۔ ہم لوگ کمپیٹیشنر تھے۔ سب افسر ایم اے ایل ایل بی تھے۔ ویسٹ پاکستان Basis پر بھرتی ہوئے تھے۔ اس وقت چار محکموں کے لئے صوبائی سروسز کا امتحان ہوتا تھا۔ جو اوّل آتے تھے انہیں صوبائی سول سروس میں مدغم کر لیا جاتا تھا، دوسرے نمبر پر ریلوے کی سروس تھی، تیسرے درجے پر سول سیکرٹریٹ سروس تھی اور چوتھے درجے پر ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن کا نمبر آتا تھا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ ہمارے ساتھ امتحان دینے والے دیگر سروسز کے افسر تو گریڈ بیس میں پہنچ گئے لیکن ہمیں ہنوز ۱۸ میں رکھا گیا تھا۔ دیگر صوبوں کے ۱۷ء کے افسر بھی گریڈ بیس میں پہنچ گئے تھے۔ اسے ستم ظریفی حالات کہیے یا لطیفہ سمجھیں کہ میں جب اے سی مستونگ تھا تو فقیر محمد بلوچ اے سی ڈھاڈر تھا۔ وہ بلوچستان کا چیف سیکرٹری بن گیا اور میں ہنوز فیروز والا میں اسسٹنٹ کمشنر تھا۔ سنٹرل سروسز کے امتحان میں بھی خالص میرٹ پر مجھے پولیس سروس ملنی چاہئے تھی جو کہ کوٹہ سسٹم کی وجہ سے نہ مل سکی۔ وہ لڑکے جن کے مجھ سے کم نمبر تھے محکمہ پولیس میں چلے گئے۔ اسی طرح سنٹرل سروسز کے جو افسر ۱۷ میں بھرتی ہوئے تھے وہ بھی گریڈ بیس میں پہنچ گئے۔

ایسا کیوں ہوتا تھا؟ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہماری Nature of Job ایک سی تھی۔ اے سی، ڈی سی کمشنر صوبائی سیکرٹری وغیرہ۔ کسی سی ایس پی افسر کا پی سی ایس افسر کے ماتحت کام کرنا موت کے مترادف تھا۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ ان میں ڈسپلن نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ یہ پی سی ایس افسروں کو ذلیل و خوار کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ قانون ان کے ہاتھ کی چھڑی اور جیب کی گھڑی تھا۔ جس کو جب اور جس طرح چاہتے ہانکتے رہتے۔ صدیق چوہدری کی طرح یہ کلمہ حق سننے کے عادی نہ تھے۔ اس سروس کو ذلیل و رُسوا کرنے کے نت نئے طریقے سوچتے رہتے۔ انہوں نے کلرکوں، اسسٹنٹوں، تحصیلداروں اور وکیلوں کو بھی اسی نکتہ نظر سے

پی سی ایس میں مدغم کیا تاکہ کھچڑی سی پک جائے اور اس کا امیج خراب ہو! ان کی دیدہ دلیری، بدتمیزی اور رعونت کے ویسے تو سینکڑوں قصے ہیں لیکن مشتے از خروارے کے طور پر چند ایک کا ذکر کیا گیا ہے۔ فضل حسین شاہ ایڈیشنل چیف سیکرٹری تھے۔ ان دنوں مرکز اور صوبے میں چپقلش رہتی تھی اور تھوڑی دیر کے لئے پی سی ایس افسروں کو ریلیف ملا۔ کسی کام کے لئے ناسک فورس قائم ہوئی جس کے سربراہ شاہ صاحب تھے۔ کمیٹی کے دوسرے ممبران تنویر ہی اور شہزاد حسن پرویز تھے۔ یہ فیصل آباد گئے۔ کمشنر فیصل آباد حفیظ اختر رندھاوا نے چناب کلب میں ان کے لئے لنچ کا انتظام کیا۔ جب یہ وہاں پہنچے تو میزبان غائب تھا۔ کمشنر صاحب کا پیغام آیا کہ آپ کھانا کھالیں۔ میں ہی اینڈ کمپنی کو گھر میں Entertain کرنے میں مصروف ہوں۔ اس سے بڑھ کر کسی ایڈیشنل چیف سیکرٹری کی ذلت اور رُسوائی کیا ہو سکتی تھی۔ وہ بغیر کھانا کھائے واپس چلے گئے۔ کمشنر بہادر نے معذرت کرنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کی۔

میں ایک طویل عرصہ سے ان کی ہٹ لسٹ پر تھا لیکن ان کا بس نہ چلتا تھا۔ ایم ایس چودھری نے مجھے کارپوریشن سے ہٹا کر اپنے خبث باطن کا اظہار تو کر دیا لیکن وہ خوشی بھی عارضی ثابت ہوئی۔ میں نہ صرف ڈی سی رحیم یار خان بن گیا بلکہ اُسے بھی کچھ دیر بعد بوریا بستر سمیٹنا پڑا۔

جب میاں صاحب نے مجھے کمشنری کی نوید دی تو درحقیقت میں اسی وقت سوچ میں پڑ گیا تھا۔ مجھے رحیم یار خان میں تقریباً چار سال ہو چلے تھے۔ میں نے سوچا کہ کمشنری کے بعد کہاں جاؤں گا۔ حالات کا پتہ نہیں ہوتا۔ کل کلاں کوئی دوسری حکومت آ سکتی ہے یا یہ حکومت ناراض ہو سکتی ہے۔ تاریخ کا طالب علم ہونے کے ناطے میں اتنا تو جانتا تھا کہ حاکموں کی پسند اور ناراضی میں بال برابر فاصلہ ہوتا ہے۔ اتنے بڑے عہدے کے بعد پھر کسی کمتر پوسٹ پر کام کرنا ممکن نہ تھا۔ میں راؤ شمشیر کا انجام دیکھ چکا تھا۔ اُسے کیپٹن رضا علی نے آؤٹ آف ٹرن پروموشن تو دلوا دی لیکن جلد ہی وہ اپنے اصل مقام پر آ گیا اور بقیہ سروس کٹی ہوئی پتنگ کی طرح گزار دی۔

اس تناظر میں جب وزیراعلیٰ نے مجھے لاہور بلایا تو میرا ذہن بالکل صاف تھا اور میں حتمی فیصلہ کر چکا تھا۔ شام کے وقت جب سی ایم سیکرٹریٹ پہنچا تو میاں صاحب کے ساتھ چودھری نثار، جسٹس فضل محمود اور جی ایم سکندر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے کچھ کہنے سے قبل ہی میں بول پڑا ”سر! چیف سیکرٹری کا استدلال درست ہے۔ میں ایک پروفیشنل افسر ہوں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ اپنے وقت پر کمشنر لگوں تو زیادہ بہتر ہوگا۔“

[جاری ہے]

جو بھی کچھ ہے..... (یادیں امجد اسلام امجد کی)

جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے

.....

میں بات کرنا چاہتا ہوں امجد پرویز کی آواز میں اس خوب صورت کلام کی شہرت اور ڈرامہ ''وارث'' کی مقبولیت سے پہلے کی جب ۱۹۷۷ میں ہر صبح پیدل گورنمنٹ کالج لاہور جانے کے لیے میں پرانی انارکلی کی طرف رواں دواں ہوتا تھا تو امجد اسلام امجد صاحب اپنے ''مقبولِ عام'' لمبرا ٹا سکوٹر کو اس کے بھرپور شور اور دھوئیں کے ساتھ ایم اے او کالج کی طرف دوڑاتے ہوئے لیک روڈ اور لٹن روڈ مزنگ کا چوراہا پار کرتے تھے۔ وہ ان دنوں ایم اے او کالج ہی میں پڑھاتے تھے۔ ہمارا یہ ''ٹاکرہ'' لگ بھگ روز ہی ہوتا تھا۔ مجھے سڑک پار کرنے کے لیے ان کے سکوٹر کے گزرنے کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔

وہ میرے لیے کوئی اجنبی نہ تھے۔ والد صاحب یزدانی جالندھری، بھائی خالد یزدانی اور ساجد یزدانی سبھی امجد صاحب کے ملنے والے اور مداح تھے اور ان کا ذکر ہمارے ہاں رہتا ہی تھا۔ پھر میں نے انھیں متعدد مشاعروں میں دیکھا سُنا بھی تھا۔ تاہم ان سے میری پہلی طویل ملاقات ایم اے او کالج لاہور کے پروفیسرز روم میں ہوئی۔ ہوا یہ کہ ایک روز میرے پیارے شاعر دوست علی اصغر عباس مجھ سے ملنے گورنمنٹ کالج آئے اور بولے: ''چل یار، آج کچھ اچھے لکھاریوں سے ملتے ہیں۔''

میں نے کہا کہ پاک ٹی ہاؤس تو ابھی 'سجا' نہ ہوگا۔ انہوں نے میری بات کا جواب دینے

حامد یزدانی

کے بجائے میرا بازو تھاما اور اوول کے ساتھ ساتھ چلتے ڈھلوانی راستے پر لے چلے۔ گیٹ سے باہر نکلے۔ ایک ایک گلاس گنے کے تازہ جوس کا پیا اور پھر ناصر باغ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے لاہور کارپوریشن کے دفتر اور نیشنل کالج آف آرٹس کے چوراہے کو عبور کرتے ہوئے پیدل ہی ایم اے او کالج جا پہنچے جہاں پہلے تو پروفیسر عارف عبدالمتین، پروفیسر خالد بزمی اور پروفیسر یونس احقر سے سلام دعا ہوئی اور پھر شعبہ اردو میں پروفیسر محمد خالد اور پروفیسر تحسین فراقی سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد ہم جس کمرے میں داخل ہوئے اس کے اندر لگائے جانے والے قہقہوں کی گونج باہر تک سنائی دے رہی تھی۔ اندر داخل ہوئے تو پروفیسر امجد اسلام امجد اپنے ہم کار دوست پروفیسر عطاالحق قاسمی کے ساتھ پاکستان ٹیلی وژن کے ابتدائی دنوں کی یادیں تازہ کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے:

''عطا، یار، کیا دن تھے وہ بھی! ڈرامے کے دوران میں کئی ڈرامے ہو جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے۔ لوک داستان ''مرزا صاحباں'' پر بنا ڈرامہ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ ڈرامے کا آخری سین آیا۔ صاحباں کے بھائیوں سے تیر کھا کے مرزا نے گرنا تھا اور بس ڈرامہ ختم۔ مگر ہوا یہ کہ سینے پر تیر کھا کر زمین پر گرنے کے بعد مرزا کو یاد آیا کہ وہ تیر لگنے پر بولنے والا مکالمہ تو بھول ہی گیا تھا۔ چناں چہ فوراً اٹھا، تیر سینے سے نکالا۔ کیمرے کی طرف دیکھ کر دردناک ڈائیلاگ بولا، تیر واپس سینے میں مارا اور دھڑام زمیں پر۔۔۔۔''

کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔ واقعہ میں حقیقت کی مقدار پر اختلاف ہو سکتا ہے مگر امجد صاحب کے ڈرامائی انداز بیاں کی تاثیر سے انکار بہت مشکل ہے۔

امجد اسلام امجد بلاشبہ ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ہر محفل کی جان بن جاتے تھے۔ خود بھی ہنستے مسکراتے تھے اور دوسروں میں بھی مسکراہٹیں بانٹتے تھے۔ جہاں دوستوں کو اپنے کاٹ دار جملوں کا نشانہ بنا کر لطف لیتے وہاں اپنے بارے میں دوستوں کے جملوں کو بھی خندہ پیشانی سے قبول کرتے بلکہ انہیں داد دیتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ہم نے حلقہ ارباب غالب کے تحت جناب ایوب خاور کے ساتھ چیئنز لنچ ہوم لاہور میں ایک شام منانے کا اہتمام کیا۔ صدارت احمد ندیم قاسمی صاحب نے کی جبکہ نظامت کی ذمہ داری میں نے نبھائی۔ اس موقع پر دیگر کے ساتھ ساتھ خالد احمد صاحب، امجد اسلام امجد صاحب اور عطا صاحب نے اپنے مضامین پیش کیے۔ عطا صاحب نے ایوب خاور کی شاعری اور شخصیت پر بات کی تمہید

باندھتے ہوئے کہا کہ انسان بنیادی طور پر 'ناقدرا' واقع ہوا ہے۔ اُسے نعمتوں کی قدر ان کے کھو جانے کے بعد ہوتی ہے۔ یہ کہتے ہوئے سامنے بیٹھے امجد صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے:

''اب عزیزی امجد اسلام امجد ہی کو دیکھ لیں جب سے اس کا سر بالوں سے محروم ہوا ہے اس نے باقاعدگی سے جیب میں کنگھی رکھنا شروع کر دی ہے۔''

اس پر جو قہقہہ بلند ہوا اس میں امجد صاحب کی آواز سب سے نمایاں تھی۔

بعد ازاں اگرچہ کچھ ناخوش گوار واقعات کی خبریں بھی ملیں تاہم جن دنوں کی بات میں کر رہا ہوں اُن دنوں تو امجد صاحب احمد ندیم قاسمی صاحب سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ جب انہیں ملک کا ایک بڑا سول اعزاز دیا گیا تو ہمارے دوست یامین صدیقی نے یوتھ فورم کے تحت لاہور میں ایک خصوصی تقریب کا انعقاد کیا جس کی صدارت صفدر محمود صاحب نے کی۔ اس تقریب میں مجھے بھی انہیں مبارک باد دینے کا موقع ملا۔ تقریب کے اختتام پر چائے کے دور میں انہوں نے ہی مجھے صفدر محمود صاحب سے متعارف بھی کروایا تھا۔ امجد صاحب کا کہنا تھا کہ ان کا اصل اعزاز یہ ہے کہ جریدہ 'فنون' کی اشاعت سے قبل احمد ندیم قاسمی صاحب ان سے شاعری بھجوانے کی فرمائش کرتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی صاحب سے محبت کی ایک مثال وہ دستاویزی فلم بھی ہے جو ندیم صاحب کی زندگی پر تیار کی گئی تھی اور جس کی تیاری میں گلزار صاحب اور امجد صاحب دونوں پیش پیش تھے۔ مجھے اس فلم کا وی ایچ ایس امجد صاحب ہی نے تحفتاً عطا کیا تھا جو اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔

اس بات میں شک نہیں کہ امجد صاحب پاکستان کے مقبول لکھاریوں میں سے تھے۔ ان کی کتابیں کثیر تعداد میں بکتی تھیں اور بزرگ اور نوجوان نسل دونوں ہی ان کی تخلیقات کو پسند کرتے تھے کیونکہ ان کی تخلیقات کا محور و مرکز محبت ہے۔ ان کی تخلیقات کی پزیرائی دنیا بھر میں ہوئی۔ 'محبت کی ایک نظم' سمیت ان کی نظموں کے عنوان ہی دیکھ لیں تو محبت کی خوشبو وجدان میں پھیلنے لگتی ہے۔ اور پھر یہ یہی محبت کبھی دریا بن کر، کبھی اوس کی صورت اور کبھی راستے میں ڈھل کر مصرعہ مصرعہ کھلتی چلی جاتی ہے:

محبت ایسا دریا ہے
کہ بارش روٹھ بھی جائے
تو پانی کم نہیں ہوتا

تمھیں مجھ سے محبت ہے
محبت کی طبیعت میں
یہ کیسا بچپنا قدرت نے رکھا ہے!

محبت خواب کی صورت
نگاہوں میں اترتی ہے
کسی مہتاب کی صورت

محبت کے مسافر زندگی جب کاٹ چکتے ہیں

جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے

سچی بات یہ ہے کہ امجد اسلام امجد مجسم محبت تھے اور اپنے دوستوں کے حلقے کو وسیع تر کرتے ہوئے وہ محبت ہی کے پھیلاؤ کا پُر خیر فریضہ انجام دے رہے تھے۔ وہ ان سینئر لکھاریوں میں سے تھے جو عمر اور تجربے کی بنیاد پر بھی کسی سے امتیازی سلوک نہ کرتے تھے۔ سبھی سے یکساں محبت اور وقار سے ملتے اور ملنے کے بعد رابطہ منقطع نہ ہونے دیتے۔ ہمارے باہم رابطے کا ایک وسیلہ حلقہ ارباب ذوق بھی رہا جس کے ہم دونوں رکن تھے۔ میں نے جب جب انتخابات میں حصہ لیا امجد صاحب نے میری تائید وحمایت بھی کی اور حوصلہ افزائی بھی۔ حلقہ کے علاوہ شہر بھر میں ہونے والے مشاعروں میں بھی اور ریڈیو ٹی وی کی ادبی تقریبات میں بھی ہماری ملاقاتیں رہتیں۔ پروڈیوسر ارشاد حسین صاحب نے ریڈیو پر جتنے مشاعرے بپا کیے ان میں سے اکثر کی میزبانی کا شرف مجھے حاصل ہوا اور ان سب میں امجد صاحب بحیثیت شاعر شریک ہوئے۔ یہ بھی میرا ایک اعزاز ہے۔ ان سے کچھ ملاقاتیں قطعی غیر متوقع بھی ہوئیں۔ پاک ٹی ہاؤس رات آٹھ نو بجے بند ہو جاتا تو ہم سب دوست پہلے پرانی انارکلی کے چائے خانوں کو آباد کرتے اور پھر چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں مال گردی کرتے۔ میں اور میرے شاعر دوست مختار حسین کھرل چیئرنگ کراس کے قریب واقع ایک پرسکون سے ریستوران میں رات کا کھانا کھاتے۔ امجد صاحب بھی اپنی بیگم کے ساتھ ڈنر کے لیے گاہے گاہے وہاں آیا کرتے تھے۔ یوں ان سے ادبی تقریبات سے ہٹ کر بھی ملاقاتیں رہتیں۔ جب بھی ملتے والد صاحب یزدانی جالندھری کا ذکر ضرور کرتے اور بہت محبت سے کرتے۔ میں کینیڈا آ گیا تو چھوٹے بھائی ماجد یزدانی کے توسط سے بھی امجد صاحب کی سلام دعا مجھے ملتی رہتی۔ حماد کے شعری مجموعہ کے لیے انھوں نے فلیپ بھی تحریر کیا تھا۔
جرمنی سے واپسی پر میں نے ان سے ایک

خصوصی اور طویل انٹرویو کی خواہش کا اظہار کیا۔ جس پر وہ بہت خوش ہوئے اور مجھے ممتاز سٹریٹ گڑھی شاہو میں واقع اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ انہی دنوں ریڈیو ڈوئچے ویلے، دی وائس آف جرمنی کے لیے غالب کی دوسو سالہ تقریبات ولادت کے حوالے سے مجھے ایک خصوصی پروگرام ریکارڈ کرنا پڑا جس میں متعدد اہم لکھاریوں کے انٹرویوز شامل تھے۔ اسی سلسلہ میں میں امجد صاحب سے ملنے ان کے گھر گیا۔ انہوں نے پرتپاک اور بے تکلف انداز میں مجھے خوش آمدید کہا۔ کھانے اور چائے سے تواضع کی اور پھر غالب کی شاعری پر ایک مدلل اور دل چسپ رائے ریکارڈ کروائی جس میں انہوں نے غالب کو آج کا شاعر قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ غالب کی شاعری دو صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اگر سدا بہار اور تروتازہ محسوس ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شاعری ہماری زندگی سے ربط رکھتی ہے، ریلیونس رکھتی ہے۔ ہمارے دکھوں اور غموں کی بات کرتی ہے، آج کے انسان کو درپیش داخلی اور خارجی مسائل کو زیرِ بحث لاتی ہے۔ اپنے موقف کو واضح کرنے کے لیے انہوں نے متعدد اشعار بھی پیش کیے اور مختلف تاریخی اور تنقیدی حوالے بھی دیئے۔ ان کی اس بصیرت افروز گفتگو نے مجھے بہت متاثر کیا اور ہمارے پروگرام کو اور بھی وقیع بنا دیا۔

غالب کے بارے میں بات کر چکے تو مجھ سے میرے قیام جرمنی کے مشاہدات و تجربات کے بارے میں پوچھنے لگے کہ وہاں رہتے ہوئے میں نے کن کن ادیبوں شاعروں کے انٹرویوز کیے اور وہ کیسے رہے۔ دورانِ گفتگو عینی آپا یعنی قرۃ العین حیدر صاحبہ سے گفتگو کو ذکر بھی آیا۔ میں نے کہا کہ عینی آپا جانے کیوں کسی کو خاطر میں نہیں لاتیں۔ مجھے بھی ان سے گفتگو کا وقت مشکل سے ملا اور بات چیت بھی گرما گرم رہی۔ اس پر امجد صاحب نے بتایا کہ ان کا مزاج ہی ایسا ہے۔

میں نے پوچھا: ''آپ کے خیال میں ایسا کیوں ہے؟''

امجد صاحب بولے: ''شاید بہت زیادہ پزیرائی نے انہیں تک چڑھی بنا دیا ہے۔ انسانی نفسیات کا ایک پہلو ہے یہ بھی۔ مجھے ایک خلیجی ملک میں ملیں۔ ایک بڑی تقریب تھی۔ میں نے بڑھ کر سلام دعا لی۔ ان کی خیریت دریافت کی اور چند ستائشی جملے بھی کہے۔ مگر میں نے دیکھا کہ وہ مجھے خاطر ہی میں نہیں لا رہیں۔ جیسے میری کچھ حیثیت ہی نہ ہو۔ بھئی، چلو ہم بہت بڑے نا سہی مگر تھوڑا بہت کام ہم نے بھی کیا تو ہے اور کچھ نام وام بھی کمایا ہے۔ کچھ احباب کی محبت

بھی حاصل کی ہے۔ کچھ ایسے گئے گزرے تو ہم بھی نہیں۔"

"تو آپ نے ان سے گلہ کیا ان کے رویے کا؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولے: "نہیں۔ میں نے اس کے بعد نہ صرف یہ کہ ان سے بات نہ کی بلکہ اس کئی روزہ تقریب میں انہیں باقاعدہ نظر انداز کیا۔ میں نے اس بات کا اہتمام کیا کہ جب کھانے یا چائے پر بھی ہم اکٹھے ہوں تو میں ان کے سامنے دوسروں کو اہمیت دوں۔ میرا مزاج تو تم جانتے ہی ہو۔ سو، میری موجودگی میں سبھی لوگ کھلکھلاتے رہتے اور میرے ہی گرد حلقہ بنائے رکھتے۔ دو دن ایسے گزرے اور تیسرے روز عینی آپا خود مجھ سے بات کرنے آئیں اور بتانے لگیں کہ انہوں نے میری تخلیقات پڑھ رکھی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ تو پھر میں نے ان سے کوئی گلہ نہ کیا بلکہ قابلِ احترام دوستوں کی طرح ملنے لگا۔ پھر جب وہ پاکستان آئیں تو میرے ساتھ کافی بے تکلف ہوگئی تھیں۔ شاید وہ سمجھ چکی تھیں کہ ہر کسی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔"

"لیکن اُن کا یہ رویہ مجھے سمجھ نہیں آیا۔" میں نے پھر عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ وہ بولے:

"یار، جب بچے کو ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار ملے تو اس کا بگڑ جانا فطری سی بات ہے۔ عینی آپا جدید اردو ادب کے خدوخال واضع کرنے والی نسل کی نمائندہ ادیبہ ہیں اور اس اعتبار سے انہیں پزیرائی بھی غیر معمولی ملی۔ تو کچھ نخرہ سا آگیا ان کے مزاج میں بھی۔ یہی لگتا ہے۔ ان کے ناول "آگ کا دریا" کو وہ شہرت ملی کہ شاید ہی کسی اردو ناول کو ملی ہو۔ تو یہ بات بھی ذہن میں رکھو۔"

"کیا سبھی بڑے تخلیق کار ایسے ہی ہوتے ہیں؟" میں نے بات جاری رکھنے کے لیے سوال کیا۔ کہنے لگے:

"سبھی کو تو مجھے پتہ نہیں۔ ہمارے ندیم صاحب ایسے نہیں ہیں۔ اچھا، لو۔۔۔ میری زندگی کا ایک تلخ تجربہ سنو۔ ن۔م۔ راشد ہمارے پسندیدہ نظم گو رہے ہیں اور اردو نظم کے حوالہ سے ہمارے ادب میں انہیں بہت بلند اور اہم مقام بھی حاصل ہے۔ ہم سبھی دوست اکثر ان کی نظمیں پڑھا کرتے اور سراہا کرتے۔ ایک دن پتہ چلا کہ وہ بیرونِ ملک سے پاکستان آرہے ہیں۔ میں نے اور عطا الحق قاسمی نے انہیں ائرپورٹ پر خوش آمدید کہنے کا پروگرام بنایا۔ ان دنوں ملک میں ہنگامی حالت نافذ تھی۔ چار افراد ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے تھے۔۔ شہر میں ہڑتال کی سی صورتِ حال تھی۔ ذرائع آمدورفت بھی متاثر ہوئے تھے۔ پھر بھی ہم راشد صاحب کے شیدائی نوجوان کسی نہ کسی صورت ائرپورٹ پہنچ گئے۔ طیارہ اترا۔ راشد صاحب باہر آئے ان کا استقبال کرنے کو بھی

نہ آیا تھا سوائے ہم دونو جوانوں کے۔ ہم نے انتہائی عقیدت سے ان کا خیر مقدم کیا اور انہیں ایک ٹیکسی میں ان کی قیام گاہ تک لے جانے کا انتظام کیا۔ ٹیکسی میں ڈرائیور کے علاوہ ہم تینوں ہی تھے۔ ہم نے سارے سفر کے دوران ان سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ تو عجب رعونت سے بیٹھے رہے اور بولے بھی تو کچھ ایسا تاثر دیا کہ پاکستان میں ان کی کچھ قدر نہیں ہے اور یہاں ان کی شاعری کو سمجھنے کا اہل بھی کوئی نہیں۔ اور بات بھی ایسے کرتے جیسے کوئی احسان کر رہے ہوں۔ ہمیں سخت مایوسی اور دکھ ہوا کہ ہمارا قدر کرنا اور اتنی مشکل سے انہیں لینے پہنچنا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا اور النایہ ہم پر ہی رعب جما رہے ہیں۔ گویا مفتوحہ علاقوں ہی کو فتح کرنے اور روندنے پر تلے ہوئے ہیں۔ سو، انہیں ان کی منزل تک پہنچایا اور خدا حافظ کہہ کر لوٹ آئے۔ پھر کبھی ان سے ملنے کی خواہش نہیں ہوئی۔ تو کبھی کبھی زیادہ تعریف بھی فن کار کو نخریلا بنا دیتی ہے۔''

اس پر میں نے کہا: ''راشد صاحب تو چلیے ناقدری کے احساس کے تحت ایسے ہوں گے مگر عینی آپا تو اپنے اُس ناول پر بات کرنے سے بھی چڑھ جاتی ہیں جس نے انہیں شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا۔ ایک گفتگو کے دوران میں شکوہ کر رہی تھیں کہ شاید لوگوں نے آگ کا دریا کے بعد انہیں پڑھا ہی نہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ انٹرویو میں آگ کا دریا پر سوال تو بنتا ہے کہ یہ ناول ایک حوالہ ہے ان کا۔''

اس پر امجد صاحب بولے: ''اصل میں کوئی تحریر ایسی ہوتی ہے جو قاری اور لکھاری میں رابطہ کا نقطہ بنتی ہے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیتی ہے۔ اور یہ نقطہ قاری کو ہمیشہ ایک یادگار کی طرح محسوس ہوتا رہتا ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ اس رائٹر کو مزید پڑھتا سنتا نہیں۔ بس وہ سیلیبریٹ کرنا چاہتا ہے اس خاص لمحے کو، اُس خاص تحریر کو جو ان کے تعارف اور رابطے کا وسیلہ بنی تھی۔ تو میرے خیال میں اس پر چڑنا نہیں چاہیے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے اور بات آگے بڑھانا چاہیے۔ میرے خیال میں یہی صحت مند رویہ ہے۔''

''آپ کا ڈرامہ 'وارث' بھی تو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا۔ کبھی آپ کو سامنا نہیں ہوا ان معاملات سے؟ میں نے اشفاق احمد صاحب کو بھی دیکھا ہے اپنے مقبول افسانے 'گڈریا' پر بات کرنے سے احتراز کرتے ہوئے۔ میں نے 'بیاض' اور وائس آف جرمنی کے لیے ایک انٹرویو کرتے ہوئے اس پر بات کرنا چاہی تو بولے کہ وہ کوئی ایسا خاص افسانہ نہیں۔ لوگوں نے جانے کیوں اسے اپنے دل کے اتنا قریب

کرلیا ہے۔'' میں کہتا چلا گیا۔

میری بات ختم ہوئی تو امجد صاحب بولے:

''دیکھو حامد، 'وارث' کے بعد، تم جانتے ہی ہو، میرے کتنے ہی ڈرامے آچکے ہیں اور کافی مقبول بھی ہوئے ہیں مگر آج بھی کہیں کوئی مداح مل جاتا ہے تو بات 'وارث' ہی سے شروع کرتا ہے۔ میں سمجھ جاتا ہوں کہ اسی ڈرامے نے اس سے میرا تعلق استوار کیا ہے۔ میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں تو وہ فوراً میرے بعد کے ڈراموں کے بارے میں رائے دیتا اور تعریف کرتا ہے۔ تو ایسا نہیں ہے کہ ایک تخلیق کی تعریف سے یہ نتیجہ نکال لیں کہ بات کرنے والے نے اس کے علاوہ کچھ پڑھا، سنا یا دیکھا نہیں۔ یا وہ باقی چیزوں کو ناپسند کرتا ہے۔ مجھے ایسے قدر دان دنیا بھر میں ملے اور ملتے رہتے ہیں۔''

''جی، ضرور ملے ہوں گے۔ ظاہر ہے عالمی مشاعروں میں آپ ملکوں ملکوں گھومے پھرے ہیں۔'' میں نے کہا

اس پر انہوں نے اپنا تازہ سفرنامہ مجھے تحفتاً دیا اور کہنے لگے کہ اس میں آپ کے بھی بہت سے دوستوں کا ذکر ہوگا اور واقعات بھی شاید دل چسپ لگیں گے۔ میں نے یونہی سفرنامہ کی ورق گردانی کرتے ہوئے ان سے کینیڈا شمالی امریکا کے سفر کی بابت پوچھا تو کہنے لگے:

''اس سفرنامے میں کینیڈا کے ڈاکٹر خالد سہیل کا بھی ذکر ہے اور نسیم سیّد کا بھی اور ماٹریال کے اس مشاعرہ کا احوال بھی جس میں ناظمِ مشاعرہ خاتون نے نظامت کے فرائض نبھانے کی آڑ میں سامعین کو اپنا پورا دیوان سنا ڈالا۔ میں، جمیل الدین عالی جی اور پروین شاکر ہم بھی اور دیگر سامعین بھی اکتائے بیٹھے تھے مگر سامعین میں سے ایک شخص انہیں مسلسل بھرپور داد دیئے جارہا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مظلوم شخص شاعرہ کا شوہر تھا۔ اور پھر وہ واقعہ بھی ہے جس میں کینیڈا سے امریکا جاتے ہوئے امیگریشن عملہ نے بالوں کے انداز، لباس یا وضع قطع کے باعث پروین شاکر کو مرد اور عالی جی کو عورت سمجھ لیا تھا۔ اس واقعہ سے سب محظوظ ہوئے تھے۔'' وہ ہنستے ہنستے بتانے لگے۔

میں نے پوچھا کہ آپ کے بے تکلف دوست کون کون ہیں تو انہوں نے دلدار پرویز بھٹی، عطاالحق قاسمی، خالد احمد اور نجیب احمد کے نام لیے۔ اس پر مجھے نجیب صاحب کا سنایا وہ واقعہ یاد آ گیا جب انہوں نے خالد احمد کے ساتھ مل کر ادارہ مطبوعات کے تحت امجد صاحب کے کیے غیر ملکی نظموں کے تراجم والی کتاب شائع کی تھی۔ نجیب صاحب بتاتے تھے: ''کتاب کی اشاعت کے چھ ماہ بعد میں جون کی ایک سخت گرم سہ پہر امجد کے گھر پہنچا۔ گھنٹی دبائی اور واپس اپنے سکوٹر پر آ بیٹھا۔ امجد نے بالائی منزل سے نیچے جھانکا اور اندر آجانے کا اشارہ

کیا۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ مجھے بس تمہیں مبارک باد کہنا ہے۔ تم نیچے آجاؤ۔ اس پر طوعاً و کرہاً وہ نیچے آیا۔ دروازہ کھولا۔ آنکھوں میں نیند کے ڈورے تھے۔ پوچھنے لگا کہ اس وقت کس بات کی مبارک باد دینے آئے ہو؟ میں نے سکوٹر موڑتے ہوئے کہا: 'آج فیروز سنز گیا تھا۔ پتہ چلا کہ آخرِ کار چھ ماہ بعد تمہاری کتاب کی ایک کاپی فروخت ہو ہی گئی ہے۔ اسی کی مبارک باد دینے آیا ہوں' یہ کہہ کر میں نے سکوٹر کی ''کِک'' دبا دی اور ممتاز سٹریٹ سے باہر نکل آیا۔ دروازے پر کھڑے امجد کی گالیاں گلی کے موڑ تک میرا پیچھا کرتی رہیں۔''

میں اس واقعہ کا سوچ کر بے ساختہ مسکرا دیا۔ امجد صاحب نے پوچھا: ''کیا ہوا؟ کس بات پر مسکرا رہے ہو؟''

میں نے کہا: ''بس آپ کے بے تکلف دوست یاد آ گئے تھے۔''

''ہاں، بہت شیطان ہیں یہ تینوں -- قمر یورش نے جو خاکہ لکھا ہے ادب کے ''تین شیطان'' تو دو تو یہی ہیں میرے دوست عطا اور خالد احمد۔ پڑھا ہے نا تم نے وہ خاکہ؟'' امجد صاحب نے پوچھا۔

''جی، کتاب میں بھی پڑھا تھا اور پھر قمر یورش صاحب سے سنا بھی۔ انہوں نے خالد احمد صاحب کے ساتھ منائی جانے والی شام میں سنایا تھا۔ خوب پسند کیا گیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

مجھے یاد ہے ان کے اسی بے تکلف دوست جناب خالد احمد کے ادبی جریدہ ''بیاض'' نے ان پر خصوصی نمبر شائع کیا تھا جس کا سرورق ان کے رنگین تصویر سے مزین تھا اور جس میں ان کے فن و شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر تحریریں شامل تھیں۔ یہ نمبر جب شائع ہوا تو میں کینیڈا آ چکا تھا۔ مجھے امجد صاحب کا خط موصول ہوا جس میں محبت بھرا گلہ تھا کہ اس خاص نمبر میں میری کوئی تحریر کیوں شامل نہیں۔ میں نے جواباً لکھا کہ میں ایک نظم جناب خالد احمد کے حوالے کر آیا تھا شاید وہ ان سے گم ہو گئی۔ پھر انہوں نے اس خط کا جواب بھی دیا اور وہ نظم انہیں بھجوانے کی تاکید کی۔ یہ اپنے جونیئرز کی حوصلہ افزائی کرنے کا ایک انداز تھا جو میں لکھاریوں میں کم کم ہی دیکھا۔

افسوس، وہ نظم نہ مجھے مل سکی اور نہ 'بیاض' میں شائع ہو سکی۔ سو، اب ان کی وفات پر ان کی یادوں پر مشتمل یہ تحریر 'بیاض' ہی میں اشاعت کے لیے عمران منظور صاحب کو بھیج رہا ہوں۔ دکھے ہوئے دل اور مغفرت کی دعا کے ساتھ -- کہ امجد صاحب کو پیش کرنے کے لیے میرے پاس جو بھی کچھ ہے بس یہی ہے۔

☆☆☆☆☆

امجد اسلام امجد۔ ایک زندہ شخصیت جو، اب یادوں میں زندہ رہے گی

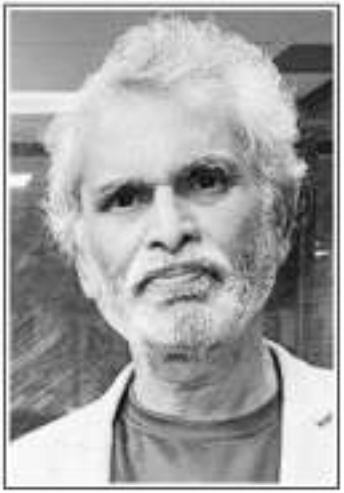

لوگ کہتے ہیں امجد اسلام امجد بھی دنیا کو خیر باد کہہ گئے۔

دل نہیں مانتا۔ دماغ تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ ادبی دنیا کی فضائیں سوگوار ہیں لیکن میری یادوں کی تمام کھڑکیاں کھل گئی ہیں اور میں انہیں خوبصورت غزلیں اور جذبوں سے سرشار نظمیں اپنے مخصوص انداز میں پیش کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ وہ داد سمیٹ رہے ہیں اور پسندیدہ نظموں کا فرمائشی پروگرام بھی مسکرا کر پورا کر رہے ہیں۔ میں کیسے مان لوں کہ امجد اسلام امجد اب ہم میں نہیں رہے۔ وہ ادبی محفلوں کی جان بھی ہیں اور اردو ادب کا مان بھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امجد اسلام امجد اس عہد کی پہچان ہیں۔ جو جو ادبی شخصیات اس عہد کی پہچان ہیں، وہ ایک ایک کر کے رخصت ہو رہی ہیں اور وہاں جا رہی ہیں، جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آتا۔ کیا واقعی امجد اسلام امجد بھی ہم سے دور چلے گئے ہیں؟ کیا ہم انہیں کبھی نہیں دیکھ سکیں گے؟ بہت سے سوال میرے دل اور دماغ میں سر اٹھا رہے ہیں اور میں ان کا جواب جاننا بھی نہیں

سید عارف معین بلے

چاہتا۔ کیونکہ امجد اسلام امجد ایک زندہ دل شخصیت کا نام ہے۔ وہ اپنی تحریروں، نظموں اور اپنی دھڑکتی غزلوں میں زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے تو میں کیسے مان لوں کہ امجد اسلام امجد اب ہم میں نہیں رہے۔ ''بیاض'' کے تازہ شمارے میرے ذوق کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ جب بھی ''بیاض'' کا نیا شمارہ ملتا ہے، میں سب سے پہلے امجد اسلام امجد کا کلام پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں اور میرے دل سے دعائیں نکلتی ہیں اور نکلتی رہی ہیں کہ عمران منظور اور نعمان منظور کو اللہ سلامت رکھے، جنہوں نے خالد احمد کی طرف سے روشن کیا جانے والا دیا بجھنے نہیں دیا اور لکھنے والوں کو ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کر رکھا ہے کہ ان کے ذوق کی تسکین بھی ہوتی ہے اور اپنے سینئرز کی تخلیقات سے فیض یاب ہونے کے موقع بھی میسر آتے ہیں۔ میرے چھوٹے بھائی ظفر معین بلے نے قافلے کے پڑاؤ اور امجد اسلام امجد کی بہت سی یادوں کو تازہ کر دیا ہے۔ اس لئے میں نے مشترکہ یادوں کو دہرانے سے گریز کیا ہے۔ لاہور سے ادب کے حوالے سے ہماری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔

لاہور نے بڑی بڑی شخصیات کو عزت اور پہچان عطا کی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مضافات یا دوسرے شہروں سے آنے والوں کو پہچان ضرور ملی ہے۔ لاہور شہر نے اہم شعبوں میں بڑی ہستیاں کم ہی پیدا کی ہیں۔ فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، عطاالحق قاسمی سمیت ادبی دنیا میں جتنے بڑے لوگ ہیں یا گزرے ہیں، ان میں سے بیشتر کا تعلق دوسرے شہروں سے تھا۔ اتنا ضرور ہے کہ لاہور نے انہیں شہرت، عزت اور مقبولیت دی۔ یا یوں کہیے کہ جب ٹیلنٹڈ شخصیات کا تعلق لاہور سے قائم ہوا تو ان کے جوہر کھلے لیکن امجد اسلام امجد سچے اور پکے لاہوری ہیں۔ قیام پاکستان سے تین سال دس دن پہلے ۴ اگست ۱۹۴۴ کو لاہور ہی میں آنکھ کھولی۔ پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ ادبی ذوق وشوق وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا چلا گیا۔ تعلیم و تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ نسل نو کی ہمیشہ حوصلہ افزائی اور پذیرائی کی۔ اہم سرکاری عہدوں پر بھی فائز رہے۔ ادب کے کئی شعبوں میں اپنے تخلیقی رنگ دکھائے۔ کتابیں لکھیں۔ تراجم کیے۔ کالم لکھے۔ تنقید اور ڈرامہ

نگاری کے حوالے سے نام کمایا۔ غزلیں تخلیق کیں اور جدید نظم نگاری کے امام قرار پائے۔

امجد اسلام امجد ادب اور ثقافت کے حوالے سے ایک معتبر نام ہے۔ وہ ڈراما نگاری کی طرف آئے اور پی ٹی وی پر ان کے ڈرامے چلے تو تہلکہ مچ گیا۔ پاکستان ہی نہیں بھارت میں بھی ان کے ڈرامے اتنے شوق سے دیکھے جاتے تھے کہ سڑکیں ویران اور بازار سنسان نظر آتے تھے۔ کیونکہ ان کا ڈراما چلنے سے پہلے لوگ اپنا تمام کام نمٹانے کے بعد ٹی اسکرین کے سامنے آکر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ تاکہ پوری یکسوئی کے ساتھ ڈراما دیکھ سکیں۔ کئی اداکاروں کی شہرت کو ان کے لکھے ہوئے ڈراموں میں اپنے جوہر دکھانے کے باعث چار چاند لگے۔ پی ٹی وی پر امجد اسلام امجد کے ڈرامے وراث نے غیر معمولی مقبولیت سمیٹی۔ اداکار محبوب عالم نے چوہدری حشمت کا کردار اتنا ڈوب کر ادا کیا کہ پھر ساری زندگی ان کے سر پر چوہدری حشمت سوار رہا۔

مجھے یاد ہے ادبی اور ثقافتی تنظیم قافلہ کے پڑاؤ بڑی باقاعدگی کے ساتھ شادمان لاہور میں ہوا کرتے تھے اور بڑے بڑے ادیب اور شاعر شریک ہوا کرتے تھے۔ ایسے ہی قافلے کے ایک پڑاؤ میں امجد اسلام امجد سے ان کا بہت سا کلام سنا گیا۔ انہیں سال کا بہترین شاعر قرار دیا گیا۔ اس محفل میں انہوں نے اپنا جو کلام سنایا، لگتا ہے وہ اسی میں سے اپنی ایک خوبصورت نظم اب بھی سنا رہے ہیں۔

میرے ساتھی میرے غم خوار ذرا یاد کرو
اپنے بھولے ہوئے اقرار ذرا یاد کرو
ایسی ہی شام تھی جب مجھ سے کہا تھا تم نے
میں تمہارا ہوں تمہارا ہی رہوں گا ہمدم
تجھ کو بھولوں تو مری یاد میں تنویر نہ ہو
اے مرے چاند مجھے ڈوبتے سورج کی قسم
مجھ سے کتنا تھا تمہیں پیار ذرا یاد کرو
اپنے بھولے ہوئے اقرار ذرا یاد کرو
وہ بھی دن تھے کہ مجھے دیکھے بنا چین تمہیں
آرزو خیز بہاروں میں نہیں آتا تھا
کس طرح پھول بنے خار ذرا یاد کرو
اپنے بھولے ہوئے اقرار ذرا یاد کرو
میرے ساتھی، میرے غم خوار ذرا یاد کرو

اسی محفل میں انہوں نے ہفت روزہ آواز

جرس کے خصوصی شمارے کیلئے آٹوگراف دیا اور ایسا لگ رہا ہے کہ وہ اپنے شعر میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں:

یہی بہت ہے کہ دل اُس کو ڈھونڈ لایا ہے
کسی کے ساتھ سہی، وہ نظر تو آیا ہے

شاید اسی لئے وہ مجھے اپنا کلام سناتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ میں کیسے مان لوں کہ انہیں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ یہ سچ ہے کہ زندگی فانی ہے لیکن اس سچائی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب کسی کی زندگی کا آفتاب ڈوب جاتا ہے تو اس کی یادوں کا سورج طلوع ہو جاتا ہے اور یہ اجالا مجھے اپنے ارد گرد محسوس ہو رہا ہے۔

امجد اسلام امجد اور عطاالحق قاسمی ہمیشہ ساتھ ساتھ نظر آتے تھے۔ اب انہیں بھی ان کی یادوں کے اجالے کے ساتھ رہنا ہے۔ امجد کل بھی ادبی محفلوں کی جان تھے اور آئندہ جتنی بھی محفلیں سجیں گی، انہیں یاد رکھا جائے گا۔ ہم لائبریریوں میں جائیں گے تو وہاں الماریوں میں بھی ان کی کتابیں ہمیں ان کی یاد دلائیں گی۔ انہوں نے بڑی خوبصورت کتابیں لکھیں، نثر میں بھی، نظم میں بھی، چند ایک نام میرے لوحِ ذہن پر روشن ہیں۔ مثلاً میرے بھی ہیں کچھ خواب، ہم اس کے ہیں، ساتواں در، عکس، فشار، برزخ، عکس، ذرا پھر سے کہنا، منشایاد کے بہترین افسانے، گیت ہمارے، آنکھوں میں تیرے سپنے، اور شہر در شہر، پھریوں ہوا۔ ہر کتاب کی اشاعت نے ان کی شہرت کو چار چاند لگائے۔ انہیں بے شمار اعزازات اور ایوارڈز سے بھی نوازا گیا۔ پرائیڈ آف پرفارمنس بھی ملا اور ستارۂ امتیاز بھی ان کا طرۂ امتیاز بنا۔ پی ٹی وی کے بہترین رائٹر کا ایوارڈ بھی انہوں نے پانچ بار اپنے نام کیا۔ امجد اسلام امجد روزنامہ ایکسپریس میں چشمِ تماشا کے زیرِ عنوان کالم بھی لکھتے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ انہوں نے یکم نومبر ۲۰۱۱ سے شروع کیا تھا اور علمی، ادبی، سیاسی اور صحافتی حلقوں میں ان کے کالم بہت پسند کئے جاتے تھے۔ اب قدرِ مکرر کے طور پر کچھ کالموں سے تو آپ فیضیاب ہو سکیں گے لیکن یہ نہ سوچئے گا کہ امجد اسلام امجد اب نہیں رہے۔ مجھے اپنے والد بزرگوار سید فخرالدین بلے مرحوم کا یہ شعر یاد آرہا ہے:

الفاظ و صوت و رنگ و نگارش کی شکل میں
زندہ ہیں لوگ آج بھی مرنے کے باوجود

☆☆☆☆☆

آہ! امجد صاحب

امجد اسلام امجد کے نام سے واقفیت تو پی ٹی وی کے ذریعے ہوئی--- جب وارث ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا تو میں تیسری چوتھی جماعت کا طالب علم تھا ہمارے گھر میں ٹی وی نہیں تھا ہر ہفتے میرے ہم جماعت جب اس کی نئی قسط کا تذکرہ بہت جذباتی انداز میں کرتے تو مجھے بھی اشتیاق ہوتا کہ کاش میں بھی اس ڈرامے کی کوئی قسط دیکھ سکوں--- یہ ڈرامہ رات کو نشر ہوتا اور ہمارے گھر سے تقریباً بیس گھروں کی دوری پر ایک حاجی صاحب ٹی وی سیٹ لائے تھے جہاں تک دیر گئے آنا جانا والد صاحب کی ناراضی کا باعث بن سکتا تھا--- میرے بڑے بھائی اور چند پھوپھی زاد ہم عمروں نے رات کو وارث شاہ دیکھ کر گھر آنے کا فیصلہ کیا--- جب رات نو بجے یہ ڈرامہ دیکھ کر گھر آ رہا تھا تو جس کیفیت میں ڈوبا ہوا تھا اس کے سامنے والد صاحب کی مشفقانہ جھڑکیوں کی کوئی پروا نہیں تھی--- اس دن امجد اسلام امجد کے قلم سے نکلی تحریر کا جادو اور محبوب عالم

شہاب صفدر

کی اداکاری کا سحر سر چڑھ کر بول رہا تھا--- پھر تو امجد صاحب سے غائبانہ ایسا تعلق جڑا کہ آج ان کی اچانک وفات کا پڑھ کر ایک دھچکا سا لگا اگر میرے کولیگ پروفیسرز صاحبان نہ تھامتے تو میں شاید کرسی سے گر جاتا۔

مجھے یاد آیا کہ میٹرک میں تھا جب فشار کی نظموں نے مجھے اپنا اسیر کر لیا میں انھیں اپنی بنائی دھن میں گنگناتا رہتا--- اس میں امجد صاحب کا گڑھی شاہو والا پتہ بھی درج تھا--- ایک دن کاغذ قلم سنبھالا اور انھیں مختصر خط لکھ کر اپنی دو غزلیں برائے اصلاح بھجوا دیں--- خلافِ توقع ہفتے بعد ان کا شفقت بھرا جواب موصول ہوا اور میں ایک ایک کو دکھاتا پھرا کہ اتنے مشہور ڈرامہ نگار اور شاعر نے مری غزلوں کی تعریف کی ہے--- خط کتابت کا یہ سلسلہ چلتا رہا--- جب وہ عطا الحق قاسمی کے جریدے معاصر کے شریک مدیر ہوئے تو اس کے لیے مجھ سے کلام منگواتے اور شائع کرتے--- کسی آتے جاتے کے ہاتھ رسالہ بھی بھجوا دیتے--- ایک چھوٹے شہر کے چھوٹے لکھنے والے سے ان کا یہ سلوک ان کی عظمت کی دلیل ہے---

ایک بار لاہور گیا تو انھیں پی سی او سے فون کیا حاضر ہونے کی اجازت چاہی-- بڑی محبت سے فرمایا--- تشریف لائیے--- بندہ حاضر ہوا تو نہ صرف خوش دلی سے استقبال کیا بلکہ پرتکلف چائے پلوائی--- والدِ محترم سے ملاقات کرائی --- تعارف میں کہا--- یہ میرے ڈیرہ اسماعیل خان کے دوست ہیں--- قاصر اور خاور کا ذکر بہت محبت سے کیا--- مجھے اس ملاقات نے سرشار کر دیا---

جب میرا پہلا شعری مجموعہ--- لہریں لیتی پیاس--- چھپنے کی بات چلی تو کمشنر ڈیرہ مظہر علی شاہ مجھے تحریک دی چند مشہور لکھنے والوں سے فوری طور پر کچھ آرا حاصل کریں تا کہ فلیپ پر درج کی جا سکیں---- میرے خط پر محسن احسان--- امجد اسلام امجد اور قمر رضا شہزاد نے فوری جواب سے نوازا---

کتاب اگرچہ بہت دیر سے مجھے خود چھاپنی پڑی لیکن جن مہربانوں نے مجھے مایوس نہیں ہونے دیا تھا میں ان کا

احسان نہیں بھولا--- ان کی رائے کو کتاب کی زینت بنایا--- جب کتاب ارسال کی تو بہت حوصلہ افزائی کی---

ایک بار ڈیرہ اسماعیل خان سے ایک نوجوان شاعر اپنی کتاب کا مسودہ لے کر لاہور ان کی خدمت میں حاضر ہوا--- پوچھا کہاں سے آئے ہیں--- اس نے جب شہر کا بتایا تو امجد صاحب فرمانے لگے--- شہاب صفدر کو جانتے ہو--- اس نے لاعلمی کا اظہار کیا--- تو اسے مشورہ دیا ڈیرہ ڈگری کالج چلے جاؤ اس مسودے میں بہت مسائل ہیں جب وہ دیکھ لیں گے پھر میں کچھ لکھ دوں گا--- وہ نوجوان ایک مرے جانے والے کو ساتھ لے کر مرے پاس آیا میں نے جب نظر ثانی کے بعد بھجوایا تو محبت سے رائے سے نوازا۔

احمد ندیم قاسمی کی برسی کے موقع پر اکادمی ادبیات تشریف لائے--- میری ایک نظم ندیم صاحب کی یاد میں کسی رسالے میں پڑھ چکے تھے--- حاضرین میں مجھے دیکھ کر پروگرام کے میزبان کو مجھے سٹیج پر بلانے کو کہا--- حالانکہ میرا نام مقررین کی فہرست میں شامل نہیں تھا تعمیل حکم کے طور پر میں نے نظم پیش کی--- پروگرام کے بعد تشکر کا اظہار کیا تو کہنے لگے آپ کا حق بنتا ہے۔

کئی بار سوچا کہ انھیں ڈیرہ اسماعیل خان مدعو کروں ایک دو بار تو حالات کچھ ساتھ دینے لگے مگر ڈیرہ میں قلاکیوں کی بندش نے کام خراب کر دیا۔

چار پانچ سال پہلے لاہور جانا ہوا تو کسی کام کے سلسلے میں ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا انھوں نے حسب عادت وقت بھی دیا تاہم ایک دوست نے زبردستی نکلنے کا موقع نہ دیا--- ان کا فون آیا تو شرمندگی سے اتنا کہہ سکا--- سر آج حاضری مشکل ہے

میں کیا اور میری حیثیت کیا لیکن شعر و ادب سے وابستگی نے چند بڑے اور اپنے وقت کے مشاہیر سے ملنے کے مواقع فراہم کر دیے مرے لیے اعزاز ہے کہ امجد اسلام امجد جیسے ڈرامہ نگار اور شاعر نے مجھے مکتوب الیہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ملاقاتیوں میں شامل ہونے کا شرف بھی بخشا۔

اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے-- آمین

☆☆☆☆☆

امجد اسلام امجد اور 'باتیں کرتے دن'

جناب امجد اسلام امجد سے ہمارا تعلق منفرد نوعیت کا ہے۔ ہم نے انہیں پہلی مرتبہ 'فنون' میں دیکھا اور بعد میں خالد احمد کے ہمراہ لکشمی چوک میں واقع 'پاکیشیا ہوٹل' کے باہر سڑک کے کنارے کھڑے ہو کے کسی شعر پہ بحث کرتے ہوئے بھی سنا تھا۔ اس روز کے بعد ہمیشہ امجد اسلام امجد سے ہمارا تعلق بڑھتا ہی گیا اور اس تعلق کو مزید گہرا کرنے میں زیادہ عمل امجد اسلام امجد کا تھا۔ ان کی نظموں سے ہمارا پہلا تعارف تو 'فنون' میں ہو چکا تھا لیکن ڈاکٹر امجد پرویز نے جب 'جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے' گائی تو یہ نظم، ہم اکثر کالج میں گنگناتے رہتے تھے حالانکہ ہماری آواز اور ڈاکٹر امجد پرویز کی آواز میں ان دنوں کچھ خاص فرق نہیں تھا، ہم نے ریاض چھوڑ دیا اور انہوں نے جاری رکھا۔ یونیورسٹی کے دنوں میں بھی امجد اسلام امجد کی 'محبت' پہ مبنی غزلیں اور نظمیں طالب علموں کے لیے خاصے کی چیزیں ہوا کرتی تھیں اور حیرت کی بات ہے کہ یہ تاثر ابھی تک برقرار ہے۔ ہمیں وہ دن بھی یاد ہیں جب پاکستان کی سڑکیں رات گئے سنسان ہو جایا کرتی تھیں کہ آج 'وارث' کی اگلی قسط لگے گی اور ایک مدت بعد بھی امجد اسلام امجد 'وارث' کے مصنف کے طور پہ پہچانے جاتے رہے تھے لیکن ہم انہیں ہمیشہ سے 'محبت کا شاعر' مانتے تھے کہ 'شاعری ان کی پہلی محبت ہے'۔ ابھی بھی بہت سے احباب، انہیں ڈرامے کے حوالے سے ہی جانتے ہیں لیکن ہم انہیں ۱۹۶۰ سے ۱۹۷۰ کی دہائی کے درمیان اس شعری نسل کے چند شاعروں میں گردانتے ہیں جنہوں نے پاکستانی اردو شاعری کا مزاج بدل ڈالا تھا۔ اپنے ہم عصروں میں امجد اسلام امجد اس لیے بھی منفرد ہیں کہ 'انہوں نے اپنی شاعری میں مختلف موضوعات کو بھی بڑے اہتمام سے شامل کیا اور خصوصاً مزاحمتی شاعری میں ان کی

نعمان منظور

نظمیں اور غزلیں انہیں ممتاز کرتی ہیں۔

شاعری ایک فطری جذبہ ہے اور جب طبیعت موزوں ہو تو آمد کا سلسلہ وجود میں آتا ہے۔ شعر ذہن پہ اس طرح نازل ہوتے ہیں جیسے بارش ہو رہی ہو، رم جھم کا موسم ہو۔ شعر کے معنی، مفہوم، فنی باریکیاں، تاثر یہ سب بعد کی چیزیں ہیں۔ شعر تو وہ ہے جو سنتے ہی دل میں اتر جائے۔ ہماری ذاتی رائے ہے کہ شاعری خصوصاً غزل اپنے اختصار اور ایجاز کی وجہ سے وجدانی کیفیت کے علاوہ معنوی حیثیت سے نثر کی نسبت زیادہ گہرائی رکھتی ہے۔ ایک شعر اگر مکمل ہے تو وہ ایک مکمل داستان کو اپنے اندر سمو سکتا ہے۔ شعر دراصل شعور کے وجد کی کیفیت کا نام ہے۔ اس کے پس منظر میں جو طوفانی صورت ہوتی ہے وہ انسان کی زندگی کے بکھرے ہوئے شیرازے کو یکجا کر کے عزم اور حوصلے کے ساتھ آگے بڑھنے کا عمل ہے۔ امجد اسلام امجد کی شاعری پہ گفتگو کرنے سے پہلے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں، ان کی جراتوں، حوصلوں اور ولولوں کی قوت کا انداز ہ لگانے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ ان کی شاعری میں بعض اشعار جو بظاہر بہت سادہ اور عام فہم سے لگتے ہیں لیکن جب ان کا پس منظر وضاحت کے ساتھ سمجھ آجائے تو ان کی سادگی پرکاری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ شعر کی ایک تعریف یہ بھی کی جاسکتی ہے کہ 'شعر سوئے ہوئے شعور کو بیدار کرتا ہے'۔ امجد اسلام امجد کی شاعری ایک طویل ریاضت اور تجربے کا ثمر ہے۔ جس طرح سونا بھٹی سے نکل کر کندن بن جاتا ہے اسی طرح شاعر کے خیال صقیل ہو کر زندگی کی راہوں کا تعین کرتے ہیں۔ عام فہم الفاظ، آسان زبان و بیان کے ساتھ احساسات کو شعری جامع پہنانا ایک بہت بڑا ہنر ہے جب کہ بعض علمی قابلیت کے حامل یا گھن گرج الفاظ استعمال کرنے کے رسیا ہیں جذباتی ہو کر الجھ جاتے ہیں۔ ہوتی تو وہ بھی شاعری ہے لیکن ان میں ادق، مہم، غیر مانوس الفاظ اور سطحی تجربے کی وجہ سے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترتے۔ شعر احساساتی رجحانی کیفیت کا نام ہے اور یہ فن بڑی ریاضت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اس میں بھی ترجیح اسے ملتی ہے جو اپنے تجربوں کی روشنی میں کچھ نتائج اخذ کر کے کچھ کہنے کی سعی کرتے ہیں۔

'باتیں کرتے دن' امجد اسلام امجد کا پندرھواں شعری مجموعہ ہے جو حال ہی میں منظر عام پہ آیا ہے۔ ہمیں یہ کتاب پڑھ کے حیرت ہوئی کہ امجد اسلام امجد نے گزشتہ چودہ مجموعوں کے برعکس اپنی شاعری میں بہت زیادہ تبدیلی کی ہے یعنی 'باتیں کرتے دن' میں، ہم ایک نئے امجد اسلام امجد سے متعارف ہوئے ہیں۔ جنہوں نے روایت کے برعکس کچھ نئی بحریں، ردیف اور قافیے استعمال کیے ہیں جو اس سے پہلے ان کی شاعری میں موجود نہیں

تھے۔ ہم نے پہلے بھی لکھا ہے کہ موضوعاتی شاعری ان کا خاصہ رہی ہے سو اس تناظر میں دو اشعار ملاحظہ فرمائیے:

وہ دن گئے کہ دیکھتے عزت ہے کس کے پاس
اب مسئلہ ہے صرف کہ طاقت ہے کس کے پاس

گرتے ہوؤں کو تھام لے، رستہ کسی کو دے
غلبت زدوں کی بھیڑ میں فرصت ہے کس کے پاس

.....

اس کتاب میں ۳۴ غزلیں اور ۳۸ نظمیں ہیں لیکن تمام ہی غزلوں میں امجد اسلام امجد نے ردیف اور قافیے خوب نبھائے ہیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اکثر احباب یہ بات کرتے ہیں کہ 'شاعر جو غزل یا نظم اوائل جوانی میں کہہ دیتا ہے وہ ہی اس کی پہچان بن جاتی ہے'، لیکن امجد اسلام امجد نے اپنی نئی کتاب میں اس بات کو غلط ثابت کر دکھایا ہے۔ ہمارے نزدیک شاعری کا تعلق عمر سے ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ ایک خداداد صلاحیت ہے جو کسی بھی شاعر کو اس وقت تک اپنے سائے تلے رکھتی ہے جب تک اس کا باطن اس کے ظاہر کی طرح صاف رہتا ہے۔ ہم نے تو ایسے بھی بے شمار شاعر دیکھے ہیں جو گزشتہ تیس برسوں سے دو چار غزلوں کے بل پر ہی جیئے جا رہے ہیں۔ اس کے برعکس امجد اسلام امجد اس لحاظ سے خوش قسمت بھی ہیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت بھی ہے کہ ان کا شعری سفر ابھی تک جاری ہے اور جاری رہے گا (ان شاء اللہ)

پرندوں کی طرح اڑتے، اگر موسم ملا ہوتا
اٹھا کر سر، یہاں چلتے اگر موسم ملا ہوتا

اپنے کمال فن کی خبر خاک سے ملی
کوزہ گروں کو داد ہنر چاک سے ملی

عشق والوں کا پرندوں سے ہے رشتہ کوئی
ایک ہی نام کو دن رات جو دہراتے ہیں

چاند کے گرد جو ہالہ ہے اسے غور سے دیکھ
مرثیہ ہے ! یہ عرضِ حال نہیں

.....

امجد اسلام امجد کا خلوص اور محبت کا طوفانی جذبہ یقین کی ایسی صورتیں پیدا کر دیتے ہیں جہاں خیر ہی خیر ہوتی ہے اور یہی خیر ایک ایسی شاعری کو جنم دیتی ہے جو صدیوں تک زندہ رہتی ہے۔ ہم نے تو سن رکھا تھا کہ 'محبت میں صرف تنہائی اور شب کے سناٹے ہی باتیں کرتے ہیں لیکن امجد اسلام امجد نے ہمیں 'باتیں کرتے دن' کے ذریعے شاعری کے ایک نئے اور انوکھے انداز سے متعارف کروا دیا ہے اور محبت کے اس نئے مفہوم پہ ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ امجد اسلام امجد پاکستانی اردو ادب اور خصوصاً شاعری کی پہچان ہیں۔ ہم نے ان کی نئی کتاب سے صرف چند شعر اوپر نقل کئے ہیں ورنہ 'باتیں کرتے دن' شاعری کی ایسی کتاب ہے جس کے بارے میں ایک کالم نا کافی ہے۔

☆☆☆☆☆

آہ! امجد اسلام امجد

آج اردو شاعری کی وہ آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سکوت کی چادر اوڑھ کر سو گئی ہے جو محبت کی چاشنی میں گندھی ہوئی تھی۔ امجد اسلام امجد محبت کا دوسرا نام تھا۔ ان کی شخصیت کی طرح ان کی شاعری بھی محبت آمیز اور محبت آموز تھی۔ انھوں نے بجا طور پر سمجھا تھا کہ جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے۔ امجد صاحب کی شخصیت اکہری نہیں تھی بلکہ گہری تھی جس میں ایک ہی وقت میں کئی دنیائیں پنہاں تھیں۔ سب سے پہلے تو وہ اردو ادب کے ایک مقبول اور بہترین استاد تھے۔ انھوں نے کئی نسلوں کی تہذیب و تربیت کی۔ شاعر وہ فطرتاً تھے۔ یہ جوہر اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر پیدائش کے وقت ہی رکھ دیا تھا۔ وہ غزل اور نظم دونوں کے شاعر تھے۔ ان کی غزل نظم سے بہتر ہے اور نظم غزل سے بہتر۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں اصناف پر قادر تھے۔ ان کی کتنی ہی غزلیں مقبول عام ہوئیں۔ نظم سننے یا پڑھنے کی چیز تو ہے لیکن یہ غزل کے اشعار کی طرح زبان زدِ عام کم ہی ہوتی ہیں لیکن امجد صاحب نے یہ معجزہ بھی کر دکھایا۔ ان کی بہت سی نظمیں بھی مقبول ہوئیں۔ وہ جب کسی مشاعرے یا ادبی تقریب میں ہوتے تو حاضرین ان سے ان کی مشہور نظمیں فرمائش کر کے سنتے۔ میں اکثر اس بات پر حیران ہوا کرتا تھا کہ امجد صاحب کو اپنی لمبی لمبی آزاد نظمیں یاد کس طرح رہ جاتی ہیں۔ وہ بہت سہولت اور روانی سے اپنی طویل آزاد نظمیں پڑھتے جاتے اور ہم سنتے جاتے۔ انھیں داد ملتی تو احساس ہوتا تھا کہ محبوبیت کیا ہوتی ہے۔ امجد صاحب شاعروں کے تو محبوب تھے ہی ادب کا معمولی ذوق رکھنے والوں کے بھی محبوب تھے۔ وہ شاعری کا ایک مستند استعارہ تھے۔ میں نے کبھی کوئی عام آدمی نہیں دیکھا جس نے امجد اسلام امجد کا نام سن کر یہ کہا ہو کہ اس نے آج سے پہلے ان کا نام نہیں سنا۔

امجد صاحب نے ٹیلی ویژن کے لیے اس زمانے میں منفرد اور مقبول ڈرامے لکھے جب بڑے بڑے ادیب ان کے ارد گرد موجود تھے۔ ایک ڈراما تھا انھوں نے ایسا لکھا کہ اس کی وجہ سے، شام ہوتے ہی پاکستان کے تمام

ناصر بشیر

بڑے شہروں کے کوچہ و بازار سنسان ہو جایا کرتے تھے۔اس ڈرامے کی مقبولیت کا سبب یہ تھا کہ امجد صاحب نے اس میں اپنی زمین اور ثقافت کے ہر وارث کی کہانی عام اور سادہ زبان میں، بے ساختہ اور سچے کرداروں کے توسل سے بیان کی تھی۔اس کے بعد لگتا نہیں تھا کہ امجد صاحب کوئی اتنا ہی مقبول ڈراما لکھ پائیں گے لیکن انھوں نے مزید ڈرامے لکھے اور اپنے معیار کو برقرار رکھا۔

امجد صاحب لاہور کیا پورے پاکستان میں منعقد ہونے والی ادبی تقریبات کی جان تھے۔جس تقریب میں وہ موجود ہوتے وہ سج جاتی۔ان کا نام کامیابی کی ضمانت تھا۔وہ جس تقریب میں چلے جاتے اس کا شہر میں کئی دن تک چرچا رہتا۔وہ محفلوں کی جان تھے۔ہر طرح کے لوگوں میں یوں گھل مل جاتے کہ اجنبیت کا شائبہ تک نہ ہوتا۔نئے شاعروں اور ادیبوں سے شفقت کا رویہ رکھتے۔انھیں بیٹا کہہ کر مخاطب کرتے۔میرا ان سے تعلق 1990 میں بنا۔میں روزنامہ پاکستان کے ادبی صفحے کا نگران تھا، سو سارے بڑے شاعروں اور ادیبوں سے میرا ربط رہتا تھا۔کبھی وہ مجھے اپنے پاس بلا لیتے کبھی وہ میری طرف آ جاتے۔ 1993 میں امجد صاحب نے روزنامہ پاکستان کے فورم میں منعقد ہونے والے نوجوانوں کے مشاعرے کی صدارت کی۔ 1994 میں میرے مجموعہ غزل ''منظر بدل گئے'' کی تعارفی تقریب ریگل چوک کے قریب دیال سنگھ مینشن میں واقع ''شیزان'' ریسٹورنٹ میں ہوئی تو امجد صاحب بطور خاص تشریف لائے اور میری شاعری کے بارے میں ایک مفصل مضمون پڑھ کر میرا حوصلہ بڑھایا۔اس کے بعد ان کے ساتھ تعلق بڑھتا گیا۔

ان کے بیٹے علی ذیشان کی شادی ہوئی تو مجھے خود فون کیا اور گھر کا پوسٹل ایڈریس مانگا تا کہ دعوت نامہ بھیج سکیں۔میں نے کہا بھی کہ آپ مجھے شادی گھر کا نام اور محل وقوع بتا دیجیے میں آ جاؤں گا لیکن انھوں نے بالاصرار مجھ سے میرے گھر کا پتا لیا اور دعوت نامہ بھیجا۔آج جب لوگ مجھے وٹس ایپ پر شادی کا دعوت نامہ بھیجتے ہیں تو امجد صاحب ضرور یاد آتے ہیں۔پاکستان ٹیلی ویژن اور ریڈیو پاکستان کے کتنے ہی مشاعرے میں نے ان کی صدارت میں پڑھے۔یہاں ایک بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ نوے کی دہائی میں جب میں امجد صاحب سے ایک تقریب میں ملا تو ان کے ساتھ کچھ تصویریں بھی بنوائیں۔یہ تصویریں جب ملتان میں میرے ایک عزیز نے دیکھیں تو اس نے کہا کہ یہ جعلی تصویریں ہیں۔تم بھلا امجد اسلام امجد تک کیسے پہنچ سکتے ہو؟ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ امجد صاحب آج سے تین دہائیاں قبل بھی شہرت کی بلندیوں پر تھے۔وہ ادبی اور شعری ذوق رکھنے والے ہر شخص کے ہیرو اور آئیڈیل تھے۔میرے نزدیک وہ آج بھی ہمارے ہیرو اور آئیڈیل ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔

☆☆☆☆☆

امجد اسلام امجد کے شعری تراجم

امجد اسلام امجد نے شاعری، ڈراما نگاری اور کالم نویسی کے میدان میں شہرت حاصل کی لیکن عام طور پر ایک مترجم کے طور پر ان کے اوصاف نمایاں نہ ہو سکے۔ امجد اسلام امجد شعرا کی اس محدود تعداد میں شامل ہیں جنھوں نے محمد کاظم کی معاونت سے براہِ راست عربی کے نام ور شعرا کی نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا، وہ جن شعرا سے متاثر ہوئے ان میں عبدالوھاب البیاتی، نزار قبانی، نازک الملائکہ، محمود درویش، سمیح القاسم اور فدوئی طوقان کے نام شامل ہیں۔

امجد اسلام امجد اپنے ترجمہ نگاری کے اس فن کے پس منظر میں ایک نظریۂ زندگی کا مکمل احساس و ادراک رکھتے ہیں۔ اپنی ترجمہ شدہ نظموں کے مجموعے ''عکس'' کے ابتدائیے میں وہ لکھتے ہیں:

''میں نے یہ نظمیں، ترجمہ برائے ترجمہ، کی خاطر نہیں کیں۔ میرے سامنے ایک واضح مقصد تھا اور وہ یہ کہ بیسویں صدی کے نصف آخر کے ایک شاعر کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ میں شاعری کے ذریعے اپنے وطن، قوم اور عالمی انسانی برادری سے نہ صرف اپنا تخلیقی تعلق قائم کروں بل کہ دنیا میں برپا عظیم اقداری کش مکش میں بھی ترقی پسند، عوام دوست اور انقلابی قوتوں کا ساتھ دوں''

ان تراجم کے لیے فلسطینی شاعری کا انتخاب ہی کیوں کیا گیا؟ اس کے لیے شاعر کے سامنے سیاسی اور طبقاتی بیداری کے عمل میں فلسطین کا بطور انسانی المیے کے سب سے نمایاں ہونا ہے۔ تیسری دنیا کے عوام کی عظیم جدوجہدِ آزادی میں مقدور بھر حصہ لینے کے ساتھ ساتھ امجد اسلام

محمد افتخار شفیع

امجد کے پیش نظر وہ ملی شعور بھی کئی سطحوں میں کارفرما دکھائی دیتا ہے جو اردو شعرا کی اس نسل کے حصے میں آیا ہے۔ ابتدائیے ہی میں آگے چل کے وہ رقم طراز ہیں:

''باقی رہی فلسطینی شاعری کے انتخاب کی بات وہ یوں ہے کہ ایک پاکستانی مسلمان ہونے کی حیثیت سے عالمی انسانی جدوجہد میں فلسطینی عوام کی جدوجہد میرے لیے، پاکستان کے بعد سب سے اہم تاریخی استعارہ ہے''

امجد اسلام امجد کو اس بات کا اعتراف ہے کہ عربی زبان سے ان کا تعلق بس واجبی نوعیت کا ہے لیکن انہوں نے ''اس کام کو شوق سے زیادہ فرض سمجھ کر کیا ہے''۔ زیر بحث نظموں کے نثری تراجم سید محمد کاظم نے کیے انہوں نے صرف نثری تراجم پر ہی اکتفا نہیں کیا بل کہ ایک ایک نظم کے سماجی اور لسانی پس منظر کے حوالے سے شاعر کے ساتھ کئی کئی گھنٹے تبادلۂ خیال بھی کیا۔ خود محمد کاظم، امجد اسلام امجد کے تراجم کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بیروت کے 'الآداب' میں جب میں نے اس مجموعے کی پہلی نظم 'بکا الی شمس حزیران' پڑھی تو اس نے مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کیا اور میں نے اس کا نثری ترجمہ کر کے امجد اسلام امجد کو دیا— اور اس نے اسے ایک دو روز کے اندر ہی اردو نظم میں ڈھال لیا - - - میں نے امجد کی اس نظم کو ایک تنقیدی نظر سے دیکھا-- مجھے ایک خوش گوار حیرت ہوئی کہ اردو میں آ کر بھی بیاتی، بیاتی ہی رہا تھا''

تراجم کا یہ سلسلہ چلا تو عربی شاعری کے خوب صورت اردو تراجم پر موقوف ہوا۔ شاعری کے بارے میں یہ بات کسی حد تک ضرور مبنی بر حقیقت ہے کہ اس کا ترجمہ دنیا کی کسی دوسری زبان میں ممکن نہیں، اور بالفرض اگر ایسا کر بھی لیا جائے تو وہ فنی نزاکتیں، علمی موشگافیاں اور جادوئی عنصر جو اصل زبان کا جزو ہوتا ہے دوسری زبان میں منتقل ہونے سے عموماً رہ جاتا ہے، امجد اسلام امجد نے کمال پختگی سے یہ تراجم اس انداز میں کیے ہیں کہ بعض اوقات وہ اسی ماحول کا حصہ دکھائی دیتے ہیں۔ محمد کاظم ان تراجم کے معیار کو پرکھتے ہوئے گواہی دیتے ہیں کہ ''میں عربی اور اردو دونوں طرف کی نظموں کو سامنے رکھ کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ امجد نے اردو نظم میں ہر جگہ اصل شاعر کی جذباتی کیفیت اور مزاج اور طرزِ احساس کو کہیں مخل نہیں ہونے دیا، چناں چہ جذباتی اور احساسی کیفیت دونوں زبانوں میں ایک ہی ہے''

امجد اسلام امجد نے اپنے تراجم میں کہیں بھی

اصل شاعر کی بات کے ابلاغ کو قاری کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا بل کہ کوئی لفظ یا ٹکڑا اضافی لانا پڑا ہے یا کہیں کوئی لفظ حذف بھی کرنا پڑا ہے تو ترجمے کا شعری موڈ برقرار رکھنے کے لیے انہوں نے ایسا کیا ہے۔ مثال کے طور پر محمود درویش کی نظم ''امرأۃ جمیلۃ فی سدوم'' کے ترجمے کا اقتباس دیکھیں:

یاخذالموت جسمک شکل المغفرۃ
وبودی لوا موت
داخل اللذۃ یا تفاحتی
یا امرأتی المنکسرہ
وبودی لوا موت
خارج العالم فی زوبعۃ مندثرہ!

ترجمہ:

تمہارے بدن کے خم و پیچ پر مغفرت کی طرح
موت وارد ہوئی!
کاش میری بھی اس طور ہی موت ہو!
تلذذ کے لمحے میں اے میری جاناں
میری پرشکستہ، پری چہرہ عورت
کاش میری بھی اس طور ہی موت ہو
فنا و بقا کی حدوں سے ادھر
اک بگولے کے بکھرے ہوئے انت میں

.....

جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے اثرات جدید عربی شاعری پر نہایت گہرے ہیں، یہ شکست ایک آفت کی شکل میں نمودار ہوئی۔ جون کی شکست کے اثرات بعد کی عربی شاعری پر نمایاں اور قابل شناخت ہیں، اس صورت حال میں ایک طرح کا احساسِ رائیگانی بھی پیدا ہوا، محمد کاظم کے خیال میں:

''سب سے زیادہ مایوس کن ردعمل اس عرصے میں یہ دکھائی دیتا ہے کہ شاعر کا خود اپنے وجود کے جواز پر سے ایمان جاتا رہا اور وہ اپنے فن اور اس کی ضرورت و منفعت کے بارے میں سوال اٹھانے لگا۔ اسے بہت شدت سے اس امر کا احساس ہوا کہ الفاظ کی جنگ (حرب الکلمات) جس میں وہ ۱۹۴۸ء کی پہلی شکست کے بعد سے برابر لگا ہوا تھا، مادی اور حقیقی نتائج کے اعتبار سے اس کی قوم اور وطن کے لیے ایک سعیٔ رائیگاں ثابت ہوئی تھی''

یہ اثرات اس عہد کے بعد کی عربی شاعری پر واضح انداز میں اثر انداز ہوتے دکھائی دیتے ہیں، مثلاً سمیح القاسم کی نظم ''قطرات دم علی خریطۃ الوطن العربی'' کے ایک بند میں یہ موضوع آیا ہے اور مترجم نے کس خوب صورتی سے اس کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے:

وقفت فی الدود
کلی اشتری خمز الاطفالی
ومسرت سینن
وحین صار الدور لی
قبلوا مانی یدی من عملۃ

ساخرین
تبدلت عملتنا یاحزین!
ترجمہ:
برس ہا برس
آنے والے دنوں کے چمک دار خوابوں
میں کھویا ہوا
میں قطارِ فنا میں قدم در قدم آگے بڑھتا رہا
اور جب میں زمانے کی دکان پر
اپنے گھر کے لیے روشنی مول لینے کی خاطر
گیا
تو مرے حال پر تیرگی ہنس پڑی
میرے ہاتھوں میں سکّوں کا انبار تھا
پر دکانِ جہاں کی کرنسی نہ تھی

تراجم ایک تہذیب کو دوسری تہذیب سے متعارف کرانے کا عمل بھی ہے۔ مصنف کی روح کا ترجمہ شدہ مواد میں حلول کر جانا ضروری ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے خیال میں:

''مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ دونوں زبانوں پر کامل دسترس رکھتا ہو، نفسیاتی اعتبار سے مترجم کو دوہرے کرب اور فکری بے قراری سے دوچار ہونا پڑتا ہے، یہ دوئی خود مترجم کی شخصیت کو توڑ دیتی ہے''

ایک مترجم کے طور پر امجد اسلام امجد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے کہیں پر بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ ان کی عربی دانی کسی حد تک سہی، محمد کاظم کے مرہون منت ہے، جس چابک دستی اور مہارت سے انھوں نے عربی نظموں کے تراجم کیے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زبان سے مکمل آشنائی نہ رکھتے ہوئے بھی اس کے مزاج، استعاروں اور علامتوں کے نظام سے خوب واقف ہیں۔ فدوی طوقان کی ایک نظم میں امجد کے ترجمے کا انداز دیکھیے:

وما قتلوا منتہیٰ
وما صلبوھا
ولکنما خرجت منتہیٰ
تعلق اقمارا فراجہانی السماء الکبیرہ
وتعلن ان المطاف القدیم انتہیٰ
وتعلن ان المطاف الجدید ابتدا

ترجمہ: منتہیٰ لاش ہے پر اسے قتل کس نے کیا؟ کب کیا؟
کون ہے جو کہے میں نے مارا اسے
اسے کون مصلوب کرتا کہ جو
سوئے دشتِ فلک
گھر سے نقشِ فنا لے کے رخصت ہوئی
اپنی خوشیوں کے چاندوں سے جھولی بھرے
یہ بتانے کہ اب زندگی کے ہر اک کہنہ انداز کی
ہو چکی انتہا
یہ بتانے کہ اب ہو رہی ہے نئے دور کی ابتدا

.....

قید و بند کی صعوبتیں آزادیِ حریت کے علم برداروں کے لیے اخلاصِ عمل کی تجربہ گاہیں ہوتی ہیں۔ فلسطینی شاعر سمیح القاسم پس

زنداں اپنے کاز کی سربلندی اور نصب العین کی ارفعیت کا اظہار یوں کرتے ہیں۔ یہاں اصل متن سے ترجمہ شدہ مواد کا ربط خاص شاعر کی فنی پختگی اور قادر الکلامی کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے:

عبثاً تقترف الاسلاک موتی
عبثاً یطبق لیل وجدار
فی دمی یصھل مزمار النہار
ولی یغنی الواتی
ونی قلبی صوتی!

ترجمہ:

نہیں سلاخوں کے بس میں مجھ کو ہلاک کرنا
فصیلِ زنداں نہ روک پائے گی راہ میری
فضول ہے یہ شب سیہ کی تباہ کاری
کہ میرے خوں میں چمکتے دن کی نفیریاں ہیں
نظر میں اپنے ہی رنگ چھائے ہیں
اور ہونٹوں پہ جو صدا ہے وہ حرف جاں ہے

جدید عربی نظم میں آزاد ہیئت کو متعارف کروانے کی تحریک میں عراق کی خاتون شاعرہ نازک الملائکہ کا نام خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ نازک الملائکہ شاید پہلی شاعرہ ہیں جنھوں نے عربی میں بحر شکنی کرتے ہوئے آزاد نظم کو باقاعدہ طور پر پیش کیا۔ اس کام میں انھیں ممتاز حیثیت اس لیے بھی حاصل ہوئی کہ ایک نقاد کی حیثیت سے انھوں نے اپنے نظریات کو متعدد مقامات کی صورت میں پیش کیا جو زیادہ تر ''الادب'' میں شائع ہوئے۔ نازک الملائکہ کی ہم عصر شاعری پر گہرے اثرات کا مطالعہ کرنے کے لیے فدوی طوقان کی ڈائری میں سے یہ اقتباس دیکھیے:

''میں ادیبہ 'ن' (نازک الملائکہ) سے پہلی بار ملی۔ مجھے کسی نے کہا تھا کہ اس کی صاف گوئی اور کھرا پن لوگوں کو اس سے نفور کر دیتا ہے لیکن مجھے وہ--- ان باتوں کے باوجود بھی اچھی لگی۔ وہ ایک ایسے رویے کی نمائندگی کرتی ہے جو اپنی ظاہری توانائی کے باوجود کم زور اور حزن آمیز ہے۔ یہ رویہ میری سرزمین کے انسان کی علامت ہے۔ 'ن' کی آواز کے پیچھے ایک جانب دارانہ جذبہ پایا جاتا ہے اور یہی میرے نزدیک اس کی کم زوری کا راز ہے۔''

امجد اسلام امجد نے نازک الملائکہ کی ایک شہرہ آفاق نظم ''الضیف'' کا ''مہمان'' کے عنوان سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ شعرو ادب کے تراجم میں نیم دلی کے ساتھ کام کرنے کی بجائے جس توجہ اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے اس کے تقریباً سبھی عکس اس ترجمے میں موجود ہیں، انچاس مصرعوں کی اس نظم کا اٹھاسی مصرعوں میں ترجمہ بظاہر عجیب لگتا ہے۔ کبھی کبھی تو اس سے بوجھل قسم کی طوالت کا احساس بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن ترجمے کے آغاز میں ہی قاری مترجم کی

فنی پختہ کاری میں اس قدر مسحور ہو جاتا
ہے کہ یہ طوالت، لطافتِ خیال میں بدل
جاتی ہے:

طرق الباب وکنافی ذھول ساورین
جوناجللہ الصمت الحزین
وعلی آفاقنا تجثم لیل لایبین
طریق الباب فقلنا: زائر جاء الینا
علہ یلقی من الغیب علینا
بعض وعد عن دیار سرقت منذ سنین
علہ یطفی نیران الحنین
وفتحنا الباب ملھوفی الماآتی صائحین:
"ضیفنا! من انت؟" "قال" "الفرح

ترجمہ:

اس کی دستک کے سمے وقفِ تحیر ہم لوگ
دشتِ غفلت میں کھڑے دیکھتے ہیں
بے سحر رات کی بے فاصلہ پہنائی کو
خاک سے تابہ فلک کھلتے چلتے جاتے ہیں
اس کی دستک کی صدا سن کے کوئی کہنے لگا
آخر کار کوئی آیا ہے
وہ چمن جس کو غنیموں نے خزاں بخت کیا
اس کے بارے میں کوئی اچھی خبر لایا ہے
قاصدِ ارضِ وطن آیا ہے!
شاید اس پاس کوئی ایسی خبر ہو جو ہمیں
غم کے بے نام الاؤ سے رہائی دے دے
نطقِ خاموش کو پھر نغمہ سرائی دے دے
ہم نے روتی ہوئی آنکھوں سے اٹھائیں پلکیں
اور امید بھرے دل سے کہا
"اے گئی رات کے مہمان! بتا کون ہے تو؟"

....

نظم چوں کہ فلسفیانہ اسلوب لیے ہوئے ہے
اس لیے اس کے ترجمے پر مکمل گرفت خاصا
مشکل کام نظر آتی ہے، مختصر ترجمہ اصل متن
کے حسن کو برباد کر سکتا تھا، سو مترجم نے
طوالت کی پروا نہ کرتے ہوئے اصل متن
کے ساتھ مکمل انصاف کیا ہے، دیکھیے:

ضیفنا الحرالجبین
کل حسن فی روابیھا سیصفو ویلین
وسنسترجع یافا وجنین
فانفجر یالھب!
نحن الضارک نحن العرب---"

ترجمہ:

ہو وہ یافا کہ جنین
اپنی چھوڑی ہوئی مٹی کا ہر اک ذرۂ پاک
وستِ دشمن سے ہمیں لینا ہے
انتقام اور غضب کے شعلے! اور بھڑک
ہم عرب لوگ ہیں انگارترے
ہم ترے ساتھ ہیں اور ساتھ رہیں گے تیرے
اور بھڑک
انتقام اور غضب کے شعلے --- اور بھڑک

....

اردو میں ترجمہ نگاری کی روایت بہت پرانی نہ
سہی لیکن تخلیقی نثر کے ساتھ ساتھ پروان

چڑھتی دکھائی دیتی ہے، شاعری میں ترجمے کا
رجحان نسبتاً بعد میں ہوا، اردو ترجمہ نگاری کی
تنگ دامنی اپنی جگہ لیکن فی الحقیقت جو تجربات
اور انکشافات معاشرتی سطح پر ارتقا پذیر نہیں
ہوتے وہاں ادب جذبات بھی نگاری سے
تعقل پسندی کی طرف سفر نہیں کرتا۔ محض
خواب جنم لیتے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے
کہ مبالغہ آرائی، جذباتیت اور تکنیک سے
آگے بڑھ کر منطقی طور پر تخلیق کے مزاج کو سمجھا
جائے۔ امجد اسلام امجد کے تراجم بے جان اور
سپاٹ طرز ترجمہ نگاری کو یکسر رد کرتے ہیں۔
مثلاً عبدالوہاب البیاتی کی نظم "بکائیہ الی شمس
حزیران" کو ہی لے لیں یہ نظم ۱۹۶۷ء کی
عرب، اسرائیل جنگ کے بعد تخلیق ہوئی،
چھے روزہ جنگ میں عربوں کی شکست خوردہ
ذہنیت کا باشعور اظہار اس نظم میں نمایاں ہے۔
ایک حساس نسل کا پورا کرب اس نظم کے چند
مصرعوں میں سمٹ آیا ہے:

یا الہ الکادحین الفقراء
نحن لم نهزم، ولکن الطغاة ولیس الکبار
هو موا هم وحدهم، من قبل ان تنفخ دیار بنار!

ترجمہ

اے خدا! اے غریبوں کے، محنت کشوں کے
خدا!
ہاں ہمارا لہو جنگ ہارا نہیں
ہم کو مارا ہے ان رہنماؤں نے جو اپنے
عشرت کدوں میں
چھپتے رہے
ان سنہری پروں والے موروں نے جو قوم کے واسطے
نقش عبرت بنے
ہم کو مارا ہے ان بے ضمیروں نے جو آبرو
کے جنازے میں
شامل ہوئے

امجد اسلام امجد کا یہ آزاد ترجمہ اس دکھ اور
کرب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا جو کسی
ترجمے میں جذبات سے عاری ہو کر ادب
کو احساسات سے تہی کر دیتا ہے۔ اسی نظم
کے اور ادیبوں نے بھی تراجم کیے لیکن ان
ترجمہ شدہ نظموں میں خیال کی وہ بوقلمونی
دکھائی نہیں دیتی جو قاری کو اپنے سحر مطالعہ
میں گرفتار کر لیتی ہے۔ ہمارے پیش نظر
عبدالوہاب البیاتی کی نظم "بکائیہ الی شمس
حزیران" ہے۔ امجد اسلام امجد کا کیا ہوا
ترجمہ دیکھیے:

مشرقی قہوہ خانوں کی سیلن میں ہم اپنے بے
کار بحثوں کے
ہاتھوں مرے
جھوٹ کے چوبی ہتھیار سج کے
ہواؤں کے گھوڑوں پہ لڑتے رہے!
موت کے شغل سے ہم شناسا نہیں
ایسے گھوڑے کے مالک ہیں جو آج تک
وادی موت کی سمت دوڑا نہیں

شہ سواروں کے پہلو میں ٹھہرا نہیں
وہ شکاری ہیں جس نے درندے تو کیا
اک پرندہ بھی ہاتھوں سے مارا نہیں
ہم نے زخموں سے اپنے قلم کے لیے
روشنائی نہ لی
روشنائی کو ارضِ وطن پر بہے
خون کے سرخ دریا سے بدلا نہیں
ہم زیاں کار تھے، ایک دوجے سے لڑتے
ہوئے کٹ مرے
اور ٹکڑے ہوئے

اسی طرح ایک اور عربی متن کا ترجمہ یوں ہوتا ہے:

نحن لم نجعل من الجرح، دواۃ
ومن الحبر دما فوق حصاۃ
شغلتنا الترھات
فقتلنا بعضنا بعضاً وھا نحن فتات

مشرقی قہوہ خانوں کی سیلن میں بیٹھے ہوئے
آج کل
مکھیوں کو پکڑنے کی بےکار دھن میں گرفتار ہیں
اور تاریخ کے سرد ملبے میں ہم ایسی
پرچھائیاں ہیں
جو مُردوں کے بہروپ میں گام زن ہیں
ہم پریشان ذہنوں کا اک خواب ہیں
جس کی تعبیر سے کوئی واقف نہیں

امجد اسلام امجد کے تراجم ایک تخلیقی عمل کا حصہ ہیں۔ جسے ایک ادیب، شاعر اور دانش ور ایک دوسرے انداز سے سامنے لاتا ہے۔ تخلیقی فن کار کا کرب ان کے ہاں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ان تراجم کے علاوہ امجد اسلام امجد نے نزار قبانی، اور محمود درویش کی نظموں کے کامیاب ترجمے بھی کیے ہیں۔ الفاظ اور مصرعوں کی تعداد کے لحاظ سے پابندی کرنے کے بجائے انھوں نے ابلاغ کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ یوں تو ادب کے ہر پہلو میں مقصدیت کی کوئی چھاپ ضرور موجود ہوتی ہے، لیکن ترجمہ کرنے والا ایک ضرورت کے تحت واضح مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترجمے کا مواد منتخب کرتا ہے۔ اس کی مثال تازہ ہوا کے ایک جھونکے سی ہوتی ہے جس سے کسی بھی ادب کے مزاج میں موجود یکسانیت، جمود اور گھٹن کا خاتمہ ہوتا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو ترجمے کے دو واضح مقاصد ہیں، ایک یہ کہ ترجمہ نئی زبان میں ہو کر اس زبان کا باقاعدہ حصہ بن جائے اور ترجمہ شدہ مواد، اصل کا ایسا نقش ہو۔ عربی تہذیب یوں تو ہمارے لیے جو اجنبی تہذیب کی چھاپ رکھتا ہوتا کہ دو قوموں کا تمدنی لحاظ سے ایک دوسرے پر تعلق منکشف ہو لیکن اس کے بہت سے پہلوؤں کو جاننا ابھی باقی ہے۔

(اس مضمون کے لیے امجد اسلام امجد کی ترجمہ شدہ کتاب "عکس" سے مدد لی گئی ہے، یہ کتاب ۱۹۷۸ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کی تھی)

☆☆☆☆☆

امجد اسلام امجد - ایک عہد ایک شخصیت

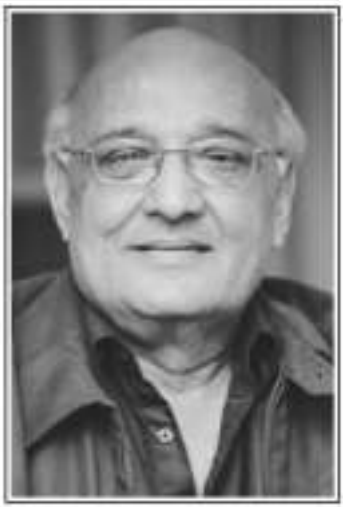

جمعہ کی صبح کلاس کے دوران مسلسل احباب کی ٹیلی فون کالز آتی رہیں جیسے ہی باہر نکلا تو امجد اسلام امجد صاحب کی خبر نے سنتے ہی جیسے زمین نے پاؤں جکڑ لیے۔ کچھ دیر کے لیے یقینی طور پر حواس قابو میں نہیں رہے کہ ابھی کل ہی تو میری بڑی تفصیل سے بات ہوئی تھی جس میں ان کی خیریت پوچھی اور عمرے کی سعادت حاصل کرنے پر مبارک باد دی۔ روضۂ رسولؐ کے سامنے بیٹھ کر احباب کو اپنی نعت سنا رہے تھے جسے موبائل میں وہاں موجود کسی نے ریکارڈ کر کے سوشل میڈیا پر شیئر کیا تھا میں نے پوچھا کہ آپ ویل چیئر پر کیوں بیٹھے تھے تو انہوں نے قدرے تفصیل سے ڈاکٹر کی ہدایات کے متعلق بتایا جس نے گھٹنے پر زیادہ وزن ڈالنے سے منع کیا ہوا تھا میں ان کے احترام میں ہمیشہ بہت مختصر بات کرتا تھا لیکن ایک دن قبل ہونے والی گفتگو میں وہ خود حیرت انگیز طور پر بات سے بات کرتے جا رہے تھے۔ ان کی بات ختم ہوئی تو میں نے 12 مارچ کو ہونے والی ''قومی ادبی نعت کانفرنس'' میں شرکت کی دعوت بھی دی اور کہا کہ مجھے آپ کے اس حوالے سے

سرور حسین نقشبندی

تاثرات ریکارڈ کرنے کے لیے حاضر ہونا ہے۔ انہیں ابھی تک یاد تھا کہ وہ پچھلی کانفرنس میں ملک سے باہر ہونے کے سبب حاضر نہیں ہو سکے تھے اور اسی وقت انہوں نے فرمایا تھا کہ آئندہ جب بھی ہوگی میں ضرور شرکت کروں گا۔ اس تاریخ کو بھی بتانے لگے کہ میں کراچی میں مصروف ہوں لیکن آپ مجھے اس کا کوئی دعوتی خط بھجوائیں تاکہ میں ان کو کہہ کر صبح کی فلائیٹ کروالوں اور اس تقریب میں ضرور حاضری دوں۔ میں نے کہا کہ آپ کی تشریف آوری ہمارے لیے اعزاز ہے لیکن ان کا کہنا تھا کہ نعت کے حوالے سے کانفرنس کا انعقاد آپ کی سعادت اور ہم تو اس میں حاضری کو شرف سمجھتے ہیں۔

رسول کریم سے والہانہ محبت ہی امجد اسلام امجد کی زندگی کا وہ پہلو تھا جو انھیں اپنے عہد کے دوسری بڑی ادبی شخصیات سے ممتاز کرتا ہے۔ حضورؐ کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ہمیشہ رسولِ کریمؐ کہا کرتے تھے اور ان کی سیرت کے اچھوتے نقش اور حوالے ان کی گفتگو میں نمایاں ہوتے تھے جس کی مثال بہت کم ادیبوں میں دکھائی دیتی ہے۔ نبیؐ رحمت کی صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی نمدیدہ آنکھیں آج بھی سامنے آرہی ہیں۔ ادب کے ان چند بڑے لوگوں میں شمار ہوتے تھے جو نوجوانوں کو اب بھی آسانی سے دستیاب تھے، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے میسج کیا ہو اور انہوں نے جواب نہ دیا ہو اور اگر کبھی کال کی اور مصروفیت کی وجہ سے نہ اٹھا سکے تو ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ فری ہونے کے بعد واپس کال نہ کی ہو۔ ایک پرائیویٹ چینل کے ہیڈ بنے تو رمضان المبارک قریب تھا اور مجھے کال کر کے بلایا اور کہا کہ آپ رمضان کے ان تیس دنوں میں نعت کے موضوع پر تیس پروگرام ڈیزائن کریں اور اس کے لیے مہمانوں کے انتظامات کرنے میں اسی طرح سہولت دی جائے گی جس طرح کسی بھی اور پروگرام کو ملے گی۔ نعت کے حوالے سے کیے جانے والے وہ پروگرام میری زندگی کے اہم ترین تھے جس میں ان کی پوری سرپرستی اور ہر طرح کا تعاون حاصل رہا۔ ایک پروگرام میں وہ خود بھی شریک ہوئے جو نعتیہ نظم کے امکانات کے موضوع پر تھا جس میں ان کی گفتگو آج بھی ذہن میں نقش ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اپنی 75 ویں سالگرہ کی تقریب پر مجھے بھی

خود فون کر کے دعوت دی کہ اس میں فیملی اور چند خاص دوستوں کو مدعو کیا ہے اور اس میں آپ نے بھی ضرور آنا ہے۔ میرے لیے اس تقریب میں شرکت یقیناً اعزاز کا باعث تھی جس کے تاثرات میں نے دو کالمز کی صورت تحریر بھی کیے جسے انہوں نے بے حد سراہا۔

میرا حوالہ صرف نعت تھا اور وہ اسی نسبت کے سبب مجھ سے محبت کرتے تھے۔ دربار رسالت کی حاضری کے آداب سے متعلق ان کی ایک نعت میں نے میڈیا پر پڑھی تو بہت زیادہ سنی اور پڑھی گئی جس کی ردیف ''آہستہ بولئے'' تھی۔ مدینہ منورہ میں پچھلے سال چند عاقبت نااندیشوں نے سیاسی مخالفین کو نشان تضحیک بنایا اور آوازیں بلند کیں تو ان دنوں یہ نعت بہت زیادہ سنی اور شیئر کی گئی جس کا اظہار انہوں نے بھی بڑی دلسوزی سے کیا اور کہا کہ اس موقع پر واقعی اس نعت کی معنویت دو چند ہوگئی ہے۔ اپنے نعتیہ مجموعے ''اسباب'' کو انہوں نے حفیظ تائب کے نام کیا ہے جو ان کے ادبی زندگی کے شباب پر شائع ہوا ورنہ ادب کی نمائندہ شخصیات کی مذہبی شاعری ان کے زندگی کے بعد ہی شائع ہوتی ہے۔ اس میں شامل حمدیں اور نعتیں سفر حرمین کے دوران عطا ہوئی تھیں جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ انہوں نے حرم کا سفر پوری ذہنی یکسوئی اور وارفتگی کے ساتھ کیا تھا جس کا عکس ان کی نعتوں میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی کالم نگاری کسی سیاسی وابستگی یا منفعت کے لیے نہیں بلکہ انہوں نے اپنے قلم کو ہمیشہ ادب پروری اور معاشرے میں مثبت اقدار کے فروغ کے لئے استعمال کیا۔ ان کی شاعری سچے جذبات اور پاکیزہ فکر کی آئینہ دار ہے۔ بلاشبہ وہ ہماری سرزمین کی ادبی شناخت اور پہچان تھے۔ اردو دنیا آج ان کے یوں اچانک چلے جانے سے بہت آزردہ ہے۔ وہ واقعی ایسی شخصیت تھے جن کے حوالے سے پورا عہد یہ فخر کر سکتا ہے کہ ہم نے انہیں قریب سے دیکھا اور ان کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ روضہ رسولؐ سے عین واپسی پر ان کا اللہ کے حضور حاضر ہو جانا، اس سفر کے لئے جمعہ کا دن کا میسر آنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ وہاں سے مغفرت کے ''اسباب'' لے کر لوٹے تھے۔

☆☆☆☆☆

غزل

جہاں تک یہ مسافت ہے
ہر اک منظر میں حیرت ہے

نجانے کب یہ چل جائے
کوئی جادُو محبت ہے

وہ کیسے غم کو جھیلے گا
ہمیں تو اس کی عادت ہے

اسے خود سے نہیں فرصت
ہمیں جس کی ضرورت ہے

دعائیں بھی ہیں بے معنی
اگر دل میں کدورت ہے

اُسی کی سمت لوٹے گا
کہ جس کی جو بھی فطرت ہے

نہیں عزت اگر شامل
تو سب بے کار شہرت ہے

ہے فن تو سرمدی تحفہ
ہُنر اس کی ریاضت ہے

عمل سے بھی کہیں آگے
کسی کا حسنِ نیت ہے

تو پھر یہ امتحاں کیا ہے
لکھی رکھی جو قسمت ہے

حکومت ہو کسی کی بھی
مقدّم تو ریاست ہے

جو دیتا ہے وہی جانے
کسی کی کتنی مہلت ہے

اسے ہی آخری سمجھو
ہے جو بھی دم غنیمت ہے

ضرورت سے زیادہ ہو
وہ دولت بھی تو لعنت ہے

مقدّر کو مرے دل سے
نجانے کیا عداوت ہے

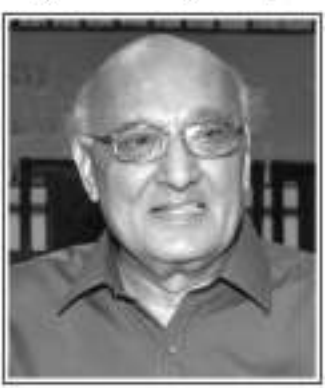

امجد اسلام امجد

غزل

آیا ہے بہت دور سے جانا ہے بہت دور
اِس دل کے مسافر کا ٹھکانہ ہے بہت دور

ہم جس کے رہے خواب میں، دیکھے گا کوئی تو
وہ شہرِ اماں ، آج جو ، مانا ہے بہت دور

دیکھو جسے ہے اپنی ہی اغراض کا مارا
لگتا ہے ابھی اپنا زمانہ ہے بہت دور

ہے دُھند میں اُلجھا ہوا رستے کا نشاں بھی
اُس خواب کی منزل کا تو پانا ہے بہت دور

محفوظ ہے ہر طرح کے رہزن کی پہنچ سے
دِل میں بھی تری یاد کا خانہ ہے بہت دُور

آنکھوں میں نہیں خواب تو پاؤں میں نہیں دم
اندیشوں بھری رات میں جانا ہے بہت دُور

امجد کہ نہیں راستہ ہجرت کے سوا اب
ہے جس پہ ترا نام وہ دانہ ہے بہت دُور

امجد اسلام امجد

دو مختصر نظمیں

یہ وقت دریا ہے خواب کوئی
نہ ابتدا کی خبر کسی کو
نہ انتہا کا حساب کوئی

بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں دنیا کے بکھیڑے
دھندلاتا چلا جائے ہے منزل کا نشاں بھی
مانا کہ نہیں رکتا کبھی وقت کا پہیہ
لازم ہے کہاں چلتا رہے ایک ہی رُخ پر

جو چین سے گزرے وہ زمانہ ہو کہیں تو
اس دل کے مسافر کا ٹھکانہ ہو کہیں تو!

امجد اسلام امجد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مجھ سے طلوعِ صبح کے منظر چھپا گئی
ٹھنڈی ہوا چلی تو مجھے نیند آ گئی

امجد اسلام امجد

اک درخت اور کٹا

ایک شجر اور گرا

اور اک چھاؤں زمیں بوس ہوئی

ایک دنیا تھی کہ باقی نہ رہی

اک زمانہ تھا کہ موجود نہیں

بے یقیں آنکھوں میں انجام کے سائے اترے

تاب لانے کے سوا چارا نہیں

درد بردوش چلو

لوٹ کے خالی آؤ

ہم ازل سے اسی اک رسم کو دہراتے ہیں

پھر سے مٹی میں ستارے کو دبا آتے ہیں.....

شاہنواز زیدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ سفر ، سَر بہ سَر رائیگاں بھی نہیں
کارِ دل محض کارِ زیاں بھی نہیں

بس وہ ایک ''امجد'' تھا

کیا عجب زمانہ تھا
دل کی لائبریری کے بے شمار خانوں میں
ان گنت کتابوں کے بے شمار نسخے تھے
شاعروں کی کثرت تھی
فیض بھی تھا ناصر بھی
جون بھی تھا ساغر بھی
وہ مگر اکیلا تھا جس کو سب ہی کہتے تھے ''شاعرِ محبت'' ہے
یار جس کے رسیا تھے
معترف زمانہ تھا
جس کی نظم پڑھ کے دل
زور سے دھڑکتا تھا
جس کے ہر سخن سے من
بھیگ بھیگ جاتا تھا
اُس کے حرف پڑھ کے ہم
دوستوں سے کہتے تھے
بس یہی وہ شاعر ہے
جو وفا کے ساگر سے سیپ چُن کے لاتا ہے
اور گہری نظموں سے
پیار کرنے والوں کو چاشنی محبت کی گھول کر پلاتا ہے
ریختے کی دنیا میں نظم کس کو کہتے ہیں؟
ہم نے اُس سے جانا تھا
لفظ کو سلیقے سے کس جگہ برتنا ہے؟
قافیہ محبت کا کس جگہ لگانا ہے
کس جگہ پہ مصرعے میں لفظ پڑھ کے قاری کے
دل کو چیر جانا ہے
بس اُسی کا خاصہ تھا
بحرِ دردِ دل سے کب عشق کرنے والوں کا
حوصلہ بڑھانا ہے
بس اُسی کو آتا تھا!
رمزِ حرف مصرعے میں کس جگہ پہ کُھلنی ہے
بس وہی سکھاتا تھا
بس وہ ایک شاعر تھا
بس وہ ایک ''امجد'' تھا

عاطف جاوید عاطف

غزل

نہیں ایسا شرارے بانٹتے ہیں
ہم آنکھوں کے ستارے بانٹتے ہیں

تمناؤں ، دعاؤں سے غرض ہے
وہ بچوں میں چھوہارے بانٹتے ہیں

کریں ہم ذوق کی ترویج ایسے
کتابیں اور شمارے بانٹتے ہیں

تسلّی کے لیے اہلِ سخن میں
ہم اپنے درد سارے بانٹتے ہیں

انہیں احباب کی بھر لیں نگاہیں
جو موتی ابر پارے بانٹتے ہیں

بہت مقبول ہو جاتے ہیں ثاقب
سکولوں میں غبارے بانٹتے ہیں

آصف ثاقب

غزل

گروہِ مقتدر کی تو حمیّت مر گئی ہے
خبر کل یہ نہ آ جائے کہ ملّت مر گئی ہے

سرِ عالم برہنہ ہیں ہوس کے شاہزادے
لٹکتے شیش ایوانوں کی غیرت مر گئی ہے

اندھیرے ہی اندھیرے رہ گئے دانش کدوں میں
کہ تقلیدِ مسلسل میں ذہانت مر گئی ہے

ذرا سی بات پر شعلے اگلتی ہیں زبانیں
درونِ گفت لہجوں کی حلاوت مر گئی ہے

سخن میں بھی لگا رکھی ہیں گر ہیں مصلحت نے
سرِ قرطاس بھی لفظوں کی حرمت مر گئی ہے

دکھائی دے تلافی کا کوئی امکان کیسے
خطا کے بعد جو کچھ تھی ندامت مر گئی ہے

ہر اک جانب سے ہیں عالی الم لہروں کی زد پر
کہیں رستے میں ہی موجِ مسرّت مر گئی ہے

جلیل عالی

غزل

چہرہ ہے بگڑا ہوا یا آئنہ ٹوٹا ہوا
یا ہر اک شے کا ہے ہم سے رابطہ ٹوٹا ہوا

کس لیے ڈھونڈیں یہاں اب آشنا صورت کوئی
جب تعلق کا ہے سارا سلسلہ ٹوٹا ہوا

رابطوں کے اتنے سارے سلسلوں کے درمیاں
سب کا اپنے آپ سے ہے رابطہ ٹوٹا ہوا

کارواں پر کس طرح راہِ سفر آسان ہو
جب ہو میرِ کارواں کا حوصلہ ٹوٹا ہوا

کیا کہیں دنیا سے اس کی بے حسی کا ماجرا
ہم نے اپنے دل کو پایا بارہا ٹوٹا ہوا

کیسے پہچانوں میں اپنی آرزو کے خدوخال
زندگی کے ہاتھ میں ہے آئنہ ٹوٹا ہوا

اس کو کر دیتا ہے پھر وہ صبر کی ہمت عطا
جب کسی بے بس کا ہو ہر آسرا ٹوٹا ہوا

جمیل یوسف

غزل

عافیت عام تھی فضاؤں میں
چل بسی ہے وہ اب خلاؤں میں

رقص میں بھی سرور عنقا ہے
بے توازن ہے اس کے پاؤں میں

طاقچوں میں دیئے نہیں جلتے
بجلی آئی گئی ہے گاؤں میں

راہی رکتے گئے ہیں ڈر ڈر کر
راستے گھر گئے بلاؤں میں

گھر کے دیوارودر بھی ششدر ہیں
ایسے جکڑے گئے جفاؤں میں

اس کی بخشش میں کچھ کمی نہ ہوئی
اس نے سب کچھ دیا جفاؤں میں

لوہو رونے سے کام رکھا ہے
جادو جاگا ہے پھر نواؤں میں

اس کی پلکوں میں راحت جاں ہے
بیٹھ جاتا ہوں ٹھنڈی چھاؤں میں

ہے ریاضِ ہنر بھی شرمندہ
بے ہنر کے پڑا ہے پاؤں میں

سید ریاض حسین زیدی

غزل

صدیوں کی زندگی ہو کہ لمحے کی زندگی
انساں کی زندگی ہے خسارے کی زندگی

کل تک لٹاتا پھرتا تھا میں اپنی روشنی
اب جی رہا ہوں اپنے ہی سائے کی زندگی

اک سمت آشیاں ہے، قفس دوسری طرف
دیکھیں کٹے گی کیسے پرندے کی زندگی

آیا ہوں پانیوں میں سفر کر کے جب سے مَیں
بے کیف لگ رہی ہے کنارے کی زندگی

اپنا الگ وجود وُہ رکھتا نہیں کوئی
مشروط ہے ہَوا سے غبارے کی زندگی

محنت کشی میں عمر گزاری تھی باپ نے
اب چین سے گزرتی ہے بیٹے کی زندگی

کب تک کرے بھلا کوئی یوں خود کلامیاں
"کیا خاک زندگی ہے اکیلے کی زندگی"

وسعت ملے گی روشنیوں کے وجود کو
ضم ہو جو کہکشاں میں ستارے کی زندگی

کیا روشنی کی کھوج میں جائے نسیم وُہ!
راس آ گئی ہو جس کو اندھیرے کی زندگی

نسیم سحر

غزل

اس لیے آئی نہ خلعت کوئی پوری مجھ کو
زہر لگتی تھی رذیلوں کی حضوری مجھ کو

اک سماعت میں محبت کی کوئی تیسرا شخص
لے گیا آ کے ضمانت پہ عبوری مجھ کو

اُس کی بھی کرنی پڑی ظرف برابر امداد
جس نے پہلے کبھی سمجھا نہ ضروری مجھ کو

اپنے صحرا میں سفر کرتے ہوئے سوچتا ہوں
مار ڈالے نہ تری زلف سے دوری مجھ کو

میں تو مٹی تھا انہیں بعد میں معلوم ہوا
رہ گئے تھے جو بناتے ہوئے نوری مجھ کو

جب بھی وحشت نے مرے گرد کوئی جال بنا
لے اُڑی ساتھ کوئی بادِ شعوری مجھ کو

حالِ دل کہنے میں صدیاں نہیں لگتیں راحت
ہے بہت ایک ملاقات ادھوری مجھ کو

راحت سرحدی

غزلیں

سیلاب دوستی کا مرے در پہ آ گیا
دشمن مرا جو ملنے مجھے گھر پہ آ گیا

پہلی گھڑی ابھی نہیں گذری زمین پر
اور وقتِ واپسیں کہ مرے سر پہ آ گیا

وہ کون ہے جو بیٹھا ہے تصویر میں ابھی
یہ کون ہے جو چپکے سے بستر پہ آ گیا

الزامِ دست بُردیِ بے جا کا کیا کریں
شیشے پہ آ گیا کبھی پتھر پہ آ گیا

پھر کیا کریں گے پردہ نشیناں اگر کبھی
جو کچھ کیا دھرا ہے وہ منظر پہ آ گیا

سر ڈھانپنے کے واسطے کچھ بھی بچا نہ تو
الزام خود سری ہی مرے سر پہ آ گیا

خاور اعجاز

آئے ہیں ہم زمین پہ ایسے زمانے میں
جب خاک بھی نہیں ہے یہاں کے خزانے میں

یارب! فروغِ ہستی ہے جس کے وجود سے
تصویر کس کی ہے ترے آئینہ خانے میں

مَیں اِس لیے بھی مِلتا ہُوں کم دوستوں کے ساتھ
آنسو نکل نہ آئیں کہیں مسکرانے میں

حیران کر دیا ہے مجھے اُس کی سوچ نے
دو ہاتھ مجھ سے آگے ہے باتیں بنانے میں

مَیں اُس کی بات بات سے تھا متفق مگر
اُس نے گنوا دیا ہے مجھے آزمانے میں

برقِ زمانہ! چاہیے اَب اور کیا تجھے
اِک آگ تو لگی ہُوئی ہے آشیانے میں

غزل

ضابطے اور ہی مصداق پہ رکھے ہوئے ہیں
آج کل صِدق وصفا طاق پہ رکھے ہوئے ہیں

دخل آنکھوں کا الجھنے میں بہت ہے لیکن
تہمتیں سب دِلِ مشتاق پہ رکھے ہوئے ہیں

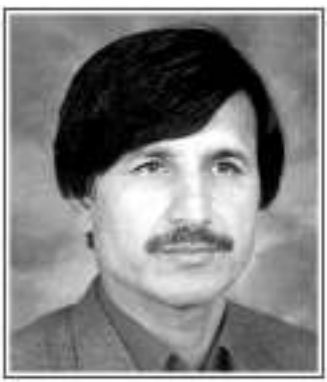

وہ جو خود معرکۂ عشق میں اترے بھی نہیں
شکوہ پسپائی کا عشاق پہ رکھے ہوئے ہیں

علم ہے مار گزیدوں کو نہیں دیر اچھی
آس کیوں دور کے تریاق پہ رکھے ہوئے ہیں

باندھ رکھا ہے محبت نے ازل سے ہم کو
سو توجہ اسی میثاق پہ رکھے ہوئے ہیں

گلزار بخاری

جانے کب سلسلۂ خیر و خبر کا ہو ظہور
دھیان ہم انفس و آفاق پہ رکھے ہوئے ہیں

دیکھیے کون سا مفہوم لیا جائے گا
بات کر کے نظر اطلاق پہ رکھے ہوئے ہیں

زر پرستی کا زمانہ ہے مگر ہم جیسے
زور سرمایۂ اخلاق پہ رکھے ہوئے ہیں

تابشِ شوق سے الفاظ ہیں روشن گلزار
یا ستارے کفِ اوراق پہ رکھے ہوئے ہیں

غزل

ہر بشر پر ہے مسلط تانا بانا خواب کا
ولولے اور وسوسے دِل کے بڑھانا خواب کا

ہر کسی کو یہ دکھائے اُس کے خوابوں کا محل
اِس لیے منظر لگے سب کہ سہانا خواب کا

دامنِ فکر و نظر میں صورتِ تیرِ نظر
رہتا ہے پیوست ہو کر اِک زمانہ خواب کا

ہجر کے عالم میں ہے اُمید کی روشن کرن
نیند سے روٹھی ہوئی آنکھوں میں آنا خواب کا

ہے سخنور کی عطا لعل و جواہر یاد کے
جن سے ہے لبریز ہر دم یہ خزانہ خواب کا

جانتے ہیں سب حیاتِ مختصر ہے عارضی
ہے عجب افسوں حقیقت کو بھلانا خواب

قہقہے اور شوخیاں سب منعکس ہیں رات کو
یہ بھی عکسِ آئینہ ہے ساحرانہ خواب کا

شادمانی کے زمانے یاد رکھنے کے لیے
عہدِ ماضی کے جھروکوں میں سجانا خواب کا

بے وفا سے بچھڑ کر کب بھول پاتا ہے کوئی
ذہن میں رہتا ہے تازہ ہر زمانہ خواب کا

بھول کر دنیا کو سرگرمِ وفا رہنا سدا
باوفاؤں کے لیے ہے تازیانہ خواب کا

ہر مریضِ عشق کے ہے واسطے خاکِ شفا
ہجر میں بھی وصل کے جلوے دِکھانا خواب کا

میرے فن نے آفریں پائی نئی رعنایاں
کس قدر اعجاز ہے یہ شاعرانہ خواب کا

رشید آفرین

غزل

کئی برس بعد میری تصویر پر پڑی گرد کو ہٹا کر
وہ جانے کیا کہہ رہی ہے مجھ سے گئے دنوں کی قسم اُٹھا کر

وہ رات کا آخری ستارہ، اداسی موسم کا استعارہ
تمھاری چھت پر گرا ہے شاید حدیثِ شام الم سنا کر

ہوا کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر اُڑو گے تو اتنا یاد رکھنا
جدھر بھی چاہے گی ساتھ لے جائے گی تمھیں بھی ہوا اُڑا کر

سنو نصیبو! خیال رکھنا یہ راستے راستہ نہ دیں گے
یہ مار ڈالیں گے اک نہ اک دن مسافروں کو تھکا تھکا کر

جو تم ٹھہرتے تو بات کرتے، اِن آنسوؤں کو فرات کرتے
مگر مری جاں! گزر گئے تم فصیلِ جاں کے دیے بجھا کر

دھواں اُٹھا تو ہر ایک دیوار میرے لفظوں سے بھر چکی تھی
وہ سو چکی تھی سکون کی نیند سوئے گی میرے خط جلا کر

بس ایک لمحے کی بھول کا نام موت ہے، اتنا یاد رکھنا
کہ زندگی زندگی نہیں ہے جیے اگر آبرو گنوا کر

بدن دریدہ، ستم رسیدہ، فگار دیدہ، دہن کشیدہ
تمھاری بستی میں جی رہے ہیں متاعِ علم و ہنر چھپا کر

رفاقتوں کے تمام وعدے ہوا میں تحلیل ہو چکے ہیں
انیسِ جاں! کون آئے گا اب ترے لیے کشتیاں جلا کر

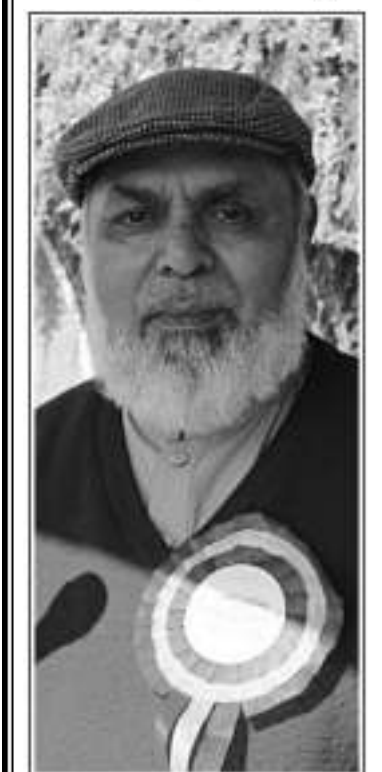

محمد انیس انصاری

غزل

مری گھٹی میں ہے یہ ابتدا سے
میں بچ رہتا ہوں ہر اک انتہا سے

دیئے سے ربط کا ہے یہ تقاضا
کہ میں لڑتا رہوں اندھی ہوا سے

لڑھک مت جایئے ہمراہ اس کے
اثر لے لیجیے چلتی ہوا سے

ترقی کے اگر دشمن بھی ہوں گے
نہ پھر بھی بچ سکیں گے ارتقا سے

جو تیرے فائدے کے بھیس میں ہو
خدا محفوظ رکھے اس بلا سے

صداقت نقش ہے فرشِ زمیں پر
اتر کر دیکھئے کوہِ انا سے

بغیرِ واسطہ ہوتا ہوں ثاقب
مخاطب خود سے اور اپنے خدا سے

منظور ثاقب

غزل

کہاں، کب کسی کا بُرا چاہتا ہوں
میں اپنے لیے راستا چاہتا ہوں

پرانا مرے خال و خد جانتا ہے
میں اب آئنہ بھی نیا چاہتا ہوں

کبھی غور سے میری آنکھوں میں دیکھو
مرا خواب کیا ہے، میں کیا چاہتا ہوں

ہوائیں مجھے اس طرح دیکھتی ہیں
دیا ہوں میں جیسے جلا چاہتا ہوں

دریچے کے وا ہونے سے کچھ نہ ہو گا
میں ڈیوڑھی کا در بھی کُھلا چاہتا ہوں

روا رکھی میں نے محبت میں شدّت
کڑی سے کڑی اب سزا چاہتا ہوں

زمیں کو بدلنے کی خواہش ہے طالب
فلک بھی کوئی دوسرا چاہتا ہوں

طالب انصاری

غزل

لٹائے ہیں دعاؤں کے خزانے
مگر روٹھے مقدر ہی نہ مانے

ہدف بننے کا ہم کو شوق بھی تھا
بہت پختہ تھے اس کے بھی نشانے

خدا جانے نظر کس کی لگی ہے
نظر آئے نہ پھر منظر سہانے

تمہارے در کا ہو کر رہ گیا ہے
گیا جو بھی تمہارے آستانے

خدا جانے کہاں رہتی ہیں خوشیاں
ملے ان سے ہوئے کتنے زمانے

رچی مہکار ہے تیری فضا میں
تری خوشبو کو بکھرایا ہوا نے

احمد جلیل

غزلیں

لہولہو ہو کے بھی اَناؤں میں جی رہا ہوں
میں امنِ عالم کی فاختاؤں میں جی رہا ہوں

مجھے تو فَردا کی دُھوپ کا ڈر نہیں رہا ہے
میں اپنے ماضی کے سبز گاؤں میں جی رہا ہوں

جو میرے اندر کا حبس ہے مجھ کو مار دے گا
میں ظاہراً تو کھلی فضاؤں میں جی رہا ہوں

اِدھر تلاشِ معاش ہے اور اُدھر محبت
میں شہر میں رہ کے اپنے گاؤں میں جی رہا ہوں

نحیف ہوتے ہوئے بھی سر پر رہیں ہمیشہ
میں چھلنی ہاتھوں کی اُن دعاؤں میں جی رہا ہوں

جو صرف اقبال دولت و زَر کے ہیں پجاری
یہی تو دُکھ ہے میں اُن خداؤں میں جی رہا ہوں

اقبال سروبہ

اپنی یادیں تو پاس رہنے دے
اور کچھ دن اُداس رہنے دے

کربلا کو نہ بُھول جاؤں کہیں
میرے ہونٹوں پہ پیاس رہنے دے

لوگ چلنے لگے تو کیا ہو گا
دل کے رستے پہ گھاس رہنے دے

پھر کسی دن نکال لینا تم
آج کے دن بھڑاس رہنے دے

مے نہیں ہے تو کیا ہوا اقبال
سامنے بس گلاس رہنے دے

غزلیں

بہہ رہے ہیں لمحہ لمحہ نور کے دھارے میں ہم
کیوں تذبذب میں پڑے ہیں صبح کے بارے میں ہم

آگ پر چلنے کے مترادف ہے اپنی زندگی
باندھ کر ڈالے گئے ہیں ایسے سیارے میں ہم

اپنی ماں کے دودھ کی تاثیر ہے خوں میں رواں
یہ نہ دیکھو پل رہے ہیں کس کے گہوارے میں ہم

لب کشائی کی اجازت ہو اگر تو کچھ کہیں
سوچتے رہتے ہیں کیا کیا آپ کے بارے میں ہم

ایک جیسا ہی تو ہے پرواز دونوں کا مزاج
فرق کر لیتے وگرنہ پھول انگارے میں ہم

یعقوب پرواز

کیا جس رنگ سے بھی استفادہ
وہی چُبھنے لگا سب سے زیادہ

خطا اس میں نہیں کوئی ہماری
کہ تم کو چاہتے ہیں بے ارادہ

مزا کچھ اور ہو نظارگی کا
اگر ہو دامنِ دل بھی کشادہ

لبوں کو دیجئے ہلکی سی جنبش
سکوت اچھا نہیں اتنا زیادہ

خدارا روک دو سبزے کی ہجرت
زمیں دیکھی نہ جائے بے لبادہ

بپھرنے سے رہے پرواز کیسے
کہ بحرِ بیکراں ہے خاک زادہ

غزل

مل کر تجھی سے میرا بچھڑنا عجیب ہے
اب عشق! ایسے بن گیا میرا نقیب ہے

تیری ادائیں ، لہجہ ترا ، یہ ترا خیال
ہے سانس میں سما گیا، دل کے قریب ہے

مانگا ہے میں نے تجھ سے تجھی کو ہر ایک پل
تو نُورِ عشق ، شہرِ وفا اور مجیب ہے

جاں سے جُدا ہے رشتۂ ایقان اس طرح
تُو ہی تو میری جان کا یکتا حبیب ہے

آئیں گے کیسے حضرتِ عیسیٰؑ یہاں کبھی
ہر شخص ہاتھ میں لیے زر کی صَلیب ہے

جب سے ہوئی ہے دوستی تم سے مری شفیق
یہ عالمِ حیات ہی میرا رقیب ہے

محمد شفیق انصاری

غزل

زیر سب ہیں زبر نہیں کوئی
وہ جو دیکھے نظر نہیں کوئی

چاہتا ہوں کہ ہم چلیں مل کر
سامنے رہ گزر نہیں کوئی

ہم ہیں بے گھر بھرے زمانے میں
دہر میں اپنا گھر نہیں کوئی

طے کریں کس طرح سفر اپنا
دل میں عزمِ سفر نہیں کوئی

کیسے محبوب ہوں زمانے کو
ہم میں پیدا ہنر نہیں کوئی

کیوں نہ اندھیر ہو نگر سارا
جب فلک پر قمر نہیں کوئی

ہاتھ میرے اُٹھے ہی رہتے ہیں
گو دعا میں اثر نہیں کوئی

اِس قفس ہی میں قید رہنا ہے
نکلیں کیسے کہ در نہیں کوئی

آج نوکِ سناں پہ جو اُٹھے
ایسا افضال سر نہیں کوئی

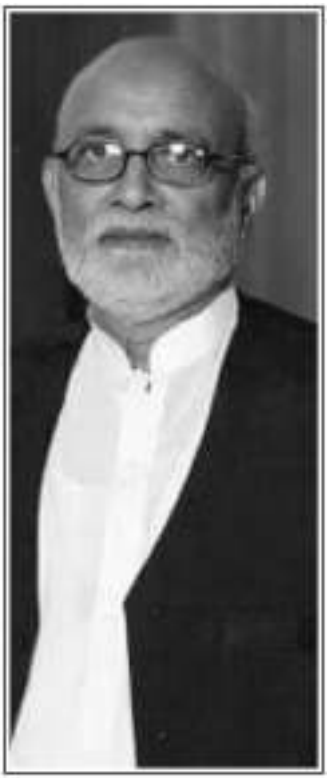

محمد افضال انجم

غزل

دیکھتے کیا ہو چشمِ حیرت سے
میں ہوں زندہ ، خدا کی رحمت سے

اک دیا بھی بجھا سکی نہ ہوا
چل رہی تھی بڑی رعونت سے

سوئے صحرا قدم نہیں اٹھتے
دل بھی اکتا گیا محبت سے

میری بستی میں ، شام کا منظر
کم نہیں ہے کسی قیامت سے

ان فقیروں سے بھی کبھی تو مل
مل کے دیکھا ہے اہلِ دولت سے

آبِ رز کو جو آبِ زر جانیں
باز آتے ہیں کب نصیحت سے؟

پوچھنے کا ، بھلا تکلف کیوں
تُو ، تو واقف ہے حالِ شوکت سے

شوکت محمود شوکت

غزلیں

سردی میں کوئی گرم جزیرہ تلاش کر
کرنوں کا روشنی کا ذخیرہ تلاش کر

ان لغزشوں پہ تو کوئی شرمندگی نہیں
میرا کوئی گناہ کبیرہ تلاش کر

میں نے کہا بھی تھا کہ مری بات مان لے
مت کوئلے کی کان میں ہیرا تلاش کر

اپنے عروج پر ہیں زمانے کی سازشیں
بیزار ہے تو گوشۂ تیرہ تلاش کر

باہر نکل کے دیکھ ذرا اس بیان سے
تلخی میں گفتگو کے بھی شیرہ تلاش کر

دوھے ہیں رنگ رنگ کے رنگوں کی لہر میں
اندر سے تو بھی کوئی کبیرا تلاش کر

رکنے کا تو نہیں یہ بڑھاپے کا سلسلہ
کشتہ نہ کوئی اور خمیرہ تلاش کر

شائع غزل یہ دل کے رسالے میں ہو سکے
ایسی کوئی حسین مدیرہ تلاش کر

دنیا کے رنگ ڈھنگ کی بیکار پیروی
اپنے لیے بھی کوئی دتیرہ تلاش کر

مسعود احمد

زمیں اکیلی نہیں گھومتی مدار کے گرد
یہ دل بھی گھومتا رہتا ہے اس دیار کے گرد

کوئی بھی جادو محبت کا توڑ ہی نہ سکا
ہزار دائرے کھینچے گئے حصار کے گرد

وہ جن کے خون میں حرص و ہوس مرکب ہے
بھٹک رہے ہیں زمانوں سے اقتدار کے گرد

فقیر دور سے بیٹھے تماشا دیکھتے ہیں
وہ کشمکش ہے زمانوں سے اختیار کے گرد

اکیلا میں نہیں بیمار میرے ساتھ کئی
کھڑے ہیں باندھ کے حلقہ اسی انار کے گرد

پرکھ رہے تھے پتنگے مجھے کسوٹی پر
ہزار شمعیں فروزاں تھیں خاکسار کے گرد

لگے ہوئے تھے اسے ہانکنے کی کوشش میں
وہ پا پیادہ کھڑے ہو کے شہسوار کے گرد

غزل

اگرچہ خوف کے سائے ہمیں ڈراتے ہیں
ہم ایسے عالمِ غم میں بھی مُسکراتے ہیں

مِری تو خیر ہے، وحشت اُترتی ہے مجھ پر
تمھارے ہاتھ میں پتھر کہاں سے آتے ہیں؟

ہمارے پاؤں پکڑتی ہے شہرِ عشق کی خاک
اگر کبھی ہمیں دشت و دمن بلاتے ہیں

ہم ایسے لوگوں کی نازک مزاجیاں دیکھو
ہم آئینوں کی طرح گر کے ٹوٹ جاتے ہیں

یہ راز کاش ! کوئی ہم پہ آشکار کرے
ہم اپنے خواب زمانے سے کیوں چھپاتے ہیں

محبتوں میں نہیں کوئی بھی سخی ہم سا
سو بے دریغ دلِ رائیگاں لُٹاتے ہیں

در اصل ہوتا نہیں اپنے ہی مقدر کا
تمام عمر جو ہم ایک گھر بناتے ہیں

ہمارے دوست ہیں دریا بھی، دشت بھی اشرف
سو تینوں مِل کے نئی کربلا بناتے ہیں

اشرف نقوی

غزل

عشق سے رغبت بڑھی تو درد کا درماں ہوا
بولنے کی چاہ میں اب بولنا آساں ہوا

زرد پتے پاؤں کے نیچے بہت بولے مگر
میں بھی ان کے ساتھ پیلی رت میں نوحہ خواں ہوا

آسماں، عرشِ بریں، حور و ملائک، انبیا
عالمِ ناسوت میں رہتے ہوئے انساں ہوا

آنکھ میں پھیلا ہوا عرشِ خدائے لم یزل
سانس میں القا ہوا، محسوس ہے یزداں ہوا

بیعتِ الہام ہونے سے بنا میرا وجود
تب کہیں جا کر میں روحِ عشق کا مہماں ہوا

جھوٹ دیمک کی طرح ہے چاٹ لیتا روح کو
جسم کے تابع جو کی ہے، روح کا نقصاں ہوا

انیس احمد

غزل

انصر حسن

یار قسم ہے تیرے نین کٹوروں کی
یہ دنیا ہے بستی کالے چوروں کی

میں صدیوں سے آگ اٹھائے پھرتا ہوں
روٹھ گئی ہے مجھ سے بارش زوروں کی

اک دیوانہ مجھ سے اکثر کہتا تھا
یاد کریں گے لوگ حکومت گوروں کی

تیرے گھر کے سامنے آ کر ناچے گی
جنگل سے بارات چلی ہے موروں کی

مال مویشی پال رہا ہوں ساجن کے
کرتا ہوں میں خدمت اس کے ڈھوروں کی

طاقت ور تو بچ نکلے سیلابوں سے
ڈوب گئی جو کشتی تھی کمزوروں کی

کھا جائیں گے بستی کے باشندوں کو
بھوک مٹاؤں کیسے آدم خوروں کی

اس نے انصر دانہ دنکا بھیج دیا
بات چلی تھی میرے خالی بوروں کی

غزل

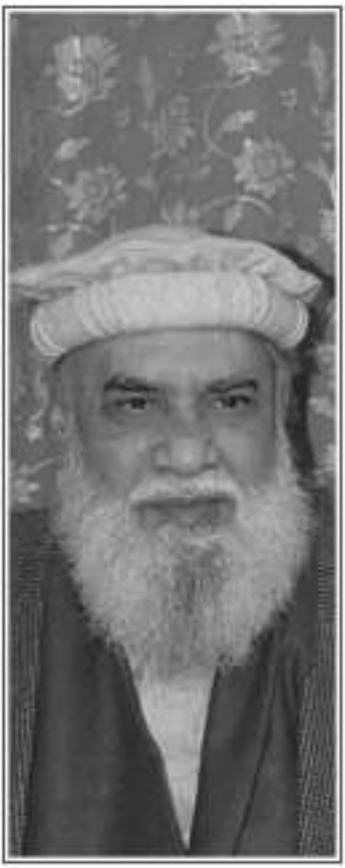

ایسا بھی نہیں صرف تمہارے نہیں رہنا
اب زندہ کسی کے بھی سہارے نہیں رہنا

پھر گھر جو بنا ہے تو بنا دریا کنارے
سوچا تھا کہ دریا کے کنارے نہیں رہنا

وہ خود ہی نہیں سمجھا کہ حالات نے ایسے
ملتے تھے کئی دن سے اشارے نہیں رہنا

میں کہتا نہیں تھا کہ سنو سچ تو یہی ہے
جو اپنے نہ رہتے ہوں ہمارے نہیں رہنا

کچھ وقت کہ پھیلا ہوا ہے یہ جو تاثر
میرے ہی نہیں اس کے بھی بارے نہیں رہنا

یار رہنا ہے اس شہر میں ہم سب نے مگر نہ
ہے فیصلہ اس شہر میں سارے نہیں رہنا

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پیڑ کب؟ دامنِ صحرا پہ ہَرے دھبّے ہیں
تُو کہاں؟ حرف کی مٹھی میں ترے ریزے ہیں

غزل

پرندے اب بھی وہیں روز آ کے بیٹھتے ہیں
چلو شرینہ کے سایے میں جا کے بیٹھتے ہیں

جو سو رہی ہیں مہ و سال کی ردا اوڑھے
وہ بھولی بسری سی یادیں جگا کے بیٹھتے ہیں

وہ جب بھی آتے ہیں ملتے ہیں کھلکھلاتے ہوئے
پھر اپنے درد کی بپتا سنا کے بیٹھتے ہیں

بہار جب سے گئی ہے چمن سے، پرسے کو
سرھانے پھول بھی آ کے صبا کے بیٹھتے ہیں

عوام ڈرتے لرزتے ہیں، آہ بھرتے ہیں
وزیر و شاہ جو مسند سجا کے بیٹھتے ہیں

روپہلی کرنیں ہمیں گدگدانے آتی ہیں
نگارِ شمس سے نظریں چرا کے بیٹھتے ہیں

ہماری روح میں بہتے ہیں نور کے جھرنے
کبھی جو پہلو میں اس دلربا کے بیٹھتے ہیں

چھلک گئی تھیں رضا چھاگلیں کئی اک دن
لبوں کو بزم میں تب سے دبا کے بیٹھتے ہیں

رضا اللہ حیدر

غزل

اس نے اک بار ہی کہا ، خاموش
اور میں عمر بھر رہا ، خاموش

ظلم کی جب ہو انتہا ، خاموش
ہے یہی درسِ کربلا ، خاموش

اشک کرتے رہے ثنا ، خاموش
رب کی ہوتی رہی عطا ، خاموش

تو یزیدی نہیں ، حسینی ہے
کر نہ فریاد دوستا ، خاموش

سارے احباب آگئے ملنے
ہو گیا دل کا جب دیا ، خاموش

لی ترے عکس نے جو انگڑائی
آئنہ ٹوٹ کر ہوا ، خاموش

ظلم ہوتے ہیں سب زمینوں پر
آسمانوں پہ ہے خُدا خاموش

اس قدر سخت حکمِ شاہی تھا
ہو گئے شہر کے گدا ، خاموش

پہلے ڈالے زبان پر تالے
پھر قلم کو کیا گیا ، خاموش

وقتِ آخر ہے کس سے پوچھوں میں
چُپ معالج ہیں اور دوا ، خاموش

حُسن اور عشق اک حقیقت ہے
کیا خبر تجھ کو ناصحا ، خاموش

پرچمِ غم تھے سب مکانوں پر
حرف خاموش تھے ، صدا خاموش

خوش بیانی عقیل دی مجھ کو
اور پھر بخت میں لکھا ، خاموش

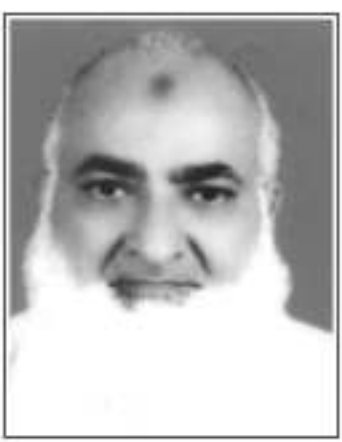

عقیل رحمانی

غزل

زخم چاٹے نہ گئے درد کمایا نہ گیا
ہم نکموں سے ترا عشق نبھایا نہ گیا

رقص کرتے ہوئے راہوں میں نکل آئے ہیں
اتنی عجلت تھی کہ بازار سجایا نہ گیا

تم نے اظہار کے چشموں پہ تصرف نہ کیا
تم سے اک گھونٹ بھی پیاسوں کو پلایا نہ گیا

سر پٹختی ہی رہیں تیز ہوائیں لیکن
جو دیا ہم نے جلایا تھا ، بجھایا نہ گیا

ایسی بے کیف محبت کا بھرم کیا رکھتے
بزمِ ہستی میں کوئی ساز بجایا نہ گیا

کور چشمی کا گِلہ ان سے تو بنتا ہی نہیں
جن کو خوش رنگ نظاروں سے لُبھایا نہ گیا

ہم بھی اس شہرِ منافق کے مکیں ہیں شاہد
جن سے اک بارِ ندامت بھی اٹھایا نہ گیا

افتخار شاہد

غزل

اپنا اگرچہ عشق تھا ناکام تجربہ
پھر بھی لگا ہے کام کا ناکام تجربہ

اک سعیٔ ناتمام تھی چھالا بنی ہوئی
سینے کا ایک زخم تھا ناکام تجربہ

اس بار بھی نہ مجھ کو فراموش کر سکے
اس بار بھی رہا ترا ناکام تجربہ

انجام عاشقی تجھے معلوم تھا اگر
پھر کیوں کیا تھا عشق کا ناکام تجربہ

وعدہ شکن پہ کیسے یقیں کر لیا گیا
کیسے بُھلا دیا گیا ناکام تجربہ

جینے کی آرزو بھی رہی نامراد سی
مرنے کا بھی سدا رہا ناکام تجربہ

جب جانتی ہوں عشق کی ناکامیوں کو میں
دانستہ کیوں کروں بھلا ناکام تجربہ

مت پوچھیے یہ زیست کٹی کس عذاب میں
ہر تجربہ تھا سانس کا ناکام تجربہ

خالدہ انور

غزل

افتخار شوکت

کوئی تو بات ہے کچھ دن سے ہاں خاموش رہتے ہیں
وگرنہ سر پھرے ہم سے کہاں خاموش رہتے ہیں

بہت مانوس ہوتے ہیں در و دیوار انساں سے
مکیں جب چھوڑ جائیں تو مکاں خاموش رہتے ہیں

یہی اک جرم ہے جس نے یہاں تک ہم کو پہنچایا
جہاں پر بولنا ہو ہم وہاں خاموش رہتے ہیں

کہانی میں فقط ان کا یہی کردار ہوتا ہے
جو ہوتے ہیں بہت ہی مہرباں خاموش رہتے ہیں

وگرنہ بات کیا ہے جو ہمیں کرنا نہیں آتی
تمہارے سامنے ہم جانِ جاں خاموش رہتے ہیں

محبت میں اک ایسا موڑ بھی آتا ہے جب شوکت
یقیں خاموش رہتے ہیں گماں خاموش رہتے ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دل اگر کلیسا ہے ، غم شبیہِ عیسیٰ ہے
بھول راہبہ بن کر ، رُوح نے بکھیرے ہیں

غزل

کچھ تقاضے لیے ، کچھ بہانے لیے
دل کی وحشت سوا ، چار خانے لیے

چاند تارے لیے رات آدھی رہی
ایک آنسو گرا ، سو فسانے لیے

وہ بصارت تو ان کی نظر لے گئی
آستاں سے گئے ، آستانے لیے

یہ تجاہل ترا عارفانہ نہیں
تو ابھی تاک میں ہے نشانے لیے

چند لمحوں میں دریا سمندر ہوئے
درد کی ناؤ میں سب زمانے لیے

سانپ تو کب سے بل میں مقید ہوا
بس سپیرے ملے شاخسانے لیے

وقت کے اس بھنور سے نکل جائیں گے
یاد رک جائے گی تازیانے لیے

جانے والے یہیں جسم اوڑھے ملے
ہم تحیر زدہ سرد خانے لیے

راہ داری کے خوابوں کو گھن لگ گیا
بس یہ تعبیر ہے کچھ ترانے لیے

سعدیہ بشیر

غزل

وہ گرداب کے چار دشاؤں میں پڑ گئی
سانسوں کی بے کلی مرے پاؤں میں پڑ گئی

دن بھر تپش بکھیرتی اور شام ہوتے ہی
تھک ہار کر تو دھوپ بھی چھاؤں میں پڑ گئی

بے زار، بے سبب یونہی رہنے کی عادتیں
اب شہر کی وبا مرے گاؤں میں پڑ گئی

اُونچی اڑان چاہے اب آدم کی فکرِ نو
دنیا کو چھوڑ کر یہ خلاؤں میں پڑ گئی

کس نے زیادہ اب کے گرانے ہیں برگِ زرد
اک جنگ، آتی جاتی ہواؤں میں پڑ گئی

اے شہر اپنی کھوئی محبت تلاش کر
نفرت کی دھول تیری فضاؤں میں پڑ گئی

کیسے قبول ہو تجھے پانے کی آرزو
اک بد دعا جو میری دعاؤں میں پڑ گئی

شاید حسیں لبوں سے محبت کشید ہو
تھوڑی سی نرم خوئی اناؤں میں پڑ گئی

آنکھیں بچائیں عہدِ گذشتہ کی دھول سے
رفتہ کی ریت اپنی کھڑاؤں میں پڑ گئی

زندانِ زندگی سے مفر اب محال ہے
شاہد ہماری ذات خطاؤں میں پڑ گئی

شاہد فرید

غزلیں

بند آنکھوں پہ وا خلد کا اک در ہے سنہرا
دیوار کے اس پار کا منظر ہے سنہرا

یہ صبح نہیں مشرقِ عارض سے نمودار
انوار فشاں خواب افق پر ہے سنہرا

ہالا ترے بازو کا ہے گاگر کے گلے میں
یا گردنِ مینائی میں زیور ہے سنہرا

دنبالۂ تر میں جڑے سیمابی نگینے
اور ہر مژۂ ناز کا خنجر ہے سنہرا

فنکار ہیں کیا ڈوبتے سورج کی شعاعیں
بادل کی طرح آئنہ پیکر ہے سنہرا

ساطع کسی مزدور کے ہاتھوں سے ہوئی ہے
جس آگ سے جمشید کا ساغر ہے سنہرا

مٹی میں شہاب اہلِ دول ہو گئے مٹی
بے زر کوئی تاریخ کا جھومر ہے سنہرا

شہاب صفدر

بچھڑے دنوں کی یاد میں افسردہ و ملول
بیٹھا ہوں باغِ داد میں افسردہ و ملول

ہے روح پر دوچند اثر بادِ سرد کا
ہوں برّ انجماد میں افسردہ و ملول

ہم سبز ٹہنیوں میں گھری لوحِ قبر ہیں
دنیائے شاد باد میں افسردہ و ملول

عبرت کی داستان سناتے ہیں بام و در
قصرِ ثمود و عاد میں افسردہ و ملول

آغوشِ گل میں شبنمِ گریاں سا ہے یہ دل
پہلوئے اعتماد میں افسردہ و ملول

شاید بساطِ رنگ الٹنے کو ہے کہ سب
ہیں بزمِ خوش نہاد میں افسردہ و ملول

اسرار جانے کیا ہے پہ دیکھا گیا شہاب
اک شہر کے سواد میں افسردہ و ملول

غزل

یہ اس کے ہاتھ میں تھا جو بھی زاویہ دیتا
وہ جیسا چاہتا ویسا مجھے بنا دیتا

ذرا سی بات تھی لیکن یہ دل سنبھل جاتا
مجھے وہ دیکھ کے تھوڑا سا مسکرا دیتا

یہ میرا کام تھا کیسے میں لوٹ کر آتا
وہ ایک بار تو بے ساختہ صدا دیتا

ہر ایک لفظ میں رکھتا میں اس کی خوشبو کو
غزل میں اپنی اسے رنگ بھی نیا دیتا

بس اک چراغ جلا دیتے میرے نام کا تم
اندھیرا ہاتھ بڑھا کر اسے ہوا دیتا

بس ایک بار پلٹنے کا سوچتے تو سہی
تمھارے پاؤں میں، میں راستہ بچھا دیتا

تم ایک بار اندھیروں کا ذکر تو کرتے
میں راستے میں کسی چاند کو جلا دیتا

تم ایک بار ادھر آ کے دیکھتے تو سہی
تمام شہر کو پھولوں سے میں سجا دیتا

اشرف کمال

غزل

روشنی ہے، رتجگے ہیں آئنوں کے شہر میں
آپ جب سے آ گئے ہیں آئنوں کے شہر میں

چشمِ حیرت سے ہمیں بھی تک رہے ہیں شیشہ گر
ہم بھی جیسے آئنے ہیں آئنوں کے شہر میں

بٹ گئے ہیں بس گروہوں میں سبھی اہلِ نظر
دائرے ہی دائرے ہیں آئنوں کے شہر میں

اہلِ عرفاں سے کہو، اس کی وضاحت کر سکیں
ہم بُرے ہیں یا بھلے ہیں آئنوں کے شہر میں

دیکھتے ہی دیکھتے پتھر ہوئے ہیں آئنے
آئنے پتھر ہوئے ہیں آئنوں کے شہر میں

آئنوں کو کر دیا کس نے مکدّر دوستو
چار سو پتھر سجے ہیں آئنوں کے شہر میں

پتھروں سے اِن کی نسبت ہو نہیں سکتی کبھی
آئنے پھر آئنے ہیں آئنوں کے شہر میں

ہیں مثالِ آئنہ اِس شہر میں کچھ اور لوگ
ہم تمھی کو ڈھونڈتے ہیں آئنوں کے شہر میں

ریزہ ریزہ دیکھیے اب کون چُنتا ہے ندیمؔ
جا بجا بکھرے پڑے ہیں آئنوں کے شہر میں

ریاض ندیم نیازی

غزل

سب ناقہ و محمل کو بچانے کے لیے تھا
کب تیر مرا دل کے نشانے کے لیے تھا

اک مرکزی کردار تھا خوابوں کے نگر کا
دراصل وہ تعبیر میں آنے کے لیے تھا

محبوب کا سَر حرمت و تکریم کا منبع
زانو کے لیے تھا کبھی شانے کے لیے تھا

محبوب کو مَن جانے کی عُجلت بھی نہیں تھی
مجھ کو تو بہت وقت منانے کے لیے تھا

تحریر مری حُسنِ معانی کا ثمر تھی
اک شعر فقط سب کو رلانے کے لیے تھا

علی حسین عابدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

روپ کو دھن جانا تو من میں لوبھ گھنیرا پھیل گیا
دریا دریا ، صحرا صحرا ، دامن میرا پھیل گیا

غزل

دیا نہ ساتھ اگر پانیوں نے ناؤ کا
تو پھر سمجھیے کہ ہے وقت چل چلاؤ کا

بس اس کے بعد ہے منزل کا گل بدن بستر
کہ سنگِ میل ہے یہ آخری پڑاؤ کا

تمام بستی تہِ آب ہونے والی ہے
یہی چلن ہے اگر بارشی کٹاؤ کا

ہجومِ شعلہ رخاں ہے گریز پا ہم سے
کہ ہم نے پاس نہ رکھا کسی الاؤ کا

کچھ اور سر پھری ابھری غریب لوگوں میں
کہ یہ نتیجہ ہے بے وجہ کے دباؤ کا

یہ بے یقینی مسلسل بڑھے گی لوگوں میں
کہ جب تلک نہ ہوا فیصلہ چناؤ کا

اصغر علی بلوچ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جدائی میں بھی ہم اک دوسرے کے ساتھ رہے
کڈھب رہا نہ وہ خالد سنور گئے ہم بھی

غزل

نازشِ مہر و ماہتاب ہے تو
واہ کس درجہ لاجواب ہے تو

جس کا ہر باب دلنشیں ہے بہت
حسن کی وہ حسیں کتاب ہے تو

جو کبھی پورا ہو نہیں سکتا
وہ ادھورا سا ایک خواب ہے تو

جس کو چاہا وہ مل گیا ہے تجھے
اے مرے یار ! کامیاب ہے تو

کیوں نہ ہو بے مثال دنیا میں
جانِ من میرا انتخاب ہے تو

جس قدر بھی کرے وہ ناز ہے کم
جانِ جاں! جس کو دستیاب ہے تو

کیسے کوئی تجھے سمجھ پائے
کبھی کانٹا کبھی گلاب ہے تو

جو ہے میرا وجود ایک سوال
پھر تو اس کا حسیں جواب ہے تو

ہوتی ہے کچھ نظر ہے آتی کچھ
زندگی کیا فقط سراب ہے تو

آ تجھے قطرہ قطرہ نوش کروں
سر سے پاؤں تلک شراب ہے تو

کچھ بتا تو کہاں سے آیا ہے
کس لیے اتنا آب آب ہے تو

ذکی طارق

غزل

اے دوست! جو تھے تری خوشی کے
دن بیت گئے وہ زندگی کے

مَیں کربلا میں کھڑا ہوا ہوں
ہیں دکھ کے پہاڑ ہر کسی کے

جنگل میں عجیب پیڑ دیکھے
وہ سائے ہوں جیسے آدمی کے

ہے دُور تلک اندھیرا لیکن
آثار ہیں اب بھی روشنی کے

باتوں سے جو پھول جھڑ رہے ہیں
سب رنگ ہیں علم و آگہی کے

اُن سے بھی ظہور دوستی کی
قائل جو نہیں تھے دوستی کے

ظہور چوہان

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

سورج اُبھرے تو زمیں پر سے اُٹھائے سائے
روشنی آئے مگر ساتھ نہ لائے سائے

غزل

تسنیم کوثر

میری سوچوں پہ نہ اب پہرے بٹھائے جائیں
میرے خوابوں کے نگینے نہ چرائے جائیں

میری جرأت پہ نہ الزام بغاوت کا لگے
اور مری ذات کے حصے نہ بنائے جائیں

میری آنکھوں میں جو روشن ہیں امیدوں کے چراغ
اب نہ یہ جبر کی پھونکوں سے بجھائے جائیں

مجھ کو پامالیٔ عزت کے ڈراوے دے کر
حوصلے اب نہ میرے پست بنائے جائیں

مجھ کو بھی منزلِ مقصد کا نشاں ڈھونڈنا ہے
کانٹے رسموں کے نہ رستے میں بچھائے جائیں

ٹوٹنے پائیں نہ تسنیم ارادے اپنے
جو قدم بڑھ گئے پیچھے نہ ہٹائے جائیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بے کسوں کی طرح ہم بھی ہاتھ مل کر رہ گئے
کیا کہیں خالد، پسِ دیوارِ زنداں کیا ہوا

شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی نذر

حروف تازہ کا کیا اہتمام اس نے کیا
شروع اس نے کیا اختتام اس نے کیا

سکوت شام کو توڑا نوائے شیریں سے
صبا کے لہجے میں ہم سے کلام اس نے کیا

دھڑکتا رہتا ہے ہر دم ہماری سانسوں میں
ہر ایک دل میں کچھ ایسے قیام اس نے کیا

اسی لیے ہیں یہ مصرعے دھلے دھلائے ہوئے
درونِ فکر و تخیل خرام اس نے کیا

پڑے تھے اوڑھ کے غفلت کی چادریں ہم تو
تمام دنیا میں اپنا یہ نام اس نے کیا

جلا کے سوچوں میں کتنے ہی آگہی کے چراغ
حسین رنگوں سے دامانِ شام اس نے کیا

کلامِ تازہ سے آتی ہیں اس کی مہکاریں
وطن کی مٹی کا یہ احترام اس نے کیا

اسی کے فیض سے سرشاریاں ہیں لفظوں میں
ہمارے نام یہ حرفوں کا جام اس نے کیا

خبر ہے ایک زمانہ ہے معترف اس کا
خبر ہے ایک زمانہ غلام اس نے کیا

عرفان صادق

غزلیں

شاخ پھولوں بھری ہے مرے ہاتھ پر
پتی پتی ہری ہے مرے ہاتھ پر

چاند جل بجھ گیا ہوگا تنور میں
سوکھی روٹی دھری ہے مرے ہاتھ پر

اس لئے تر ہیں رنگوں سے یہ انگلیاں
ایک تتلی مری ہے مرے ہاتھ پر

کیا یہ اک آنسوؤں کی لڑی ہے فقط
یا کوئی جل پری ہے مرے ہاتھ پر

اُس نجومی کو آنکھوں میں سب مل گیا
دھیان اک سرسری ہے مرے ہاتھ پر

ایک شب شاہزادے نے رکھے تھے لب
اک نشاں مرمریں ہے مرے ہاتھ پر

کب لکیروں سے دیوار و در بن سکے
سو وہی بے گھری ہے مرے ہاتھ پر

رخشندہ نوید

عکس بنتا گیا تھا پانی میں
نصب اک آئنہ تھا پانی میں
پھر کہیں جا کے بن سکا آنسو
ایک عرصہ رہا تھا پانی میں
موج سے موج کی بغلگیری
ہجر کا سلسلہ تھا پانی میں
میں اسے روشنی سمجھتی رہی
وہ تو بجھتا دیا تھا پانی میں
ایسے ہم لوگ مل نہیں سکتے
جیسے پانی مِلا تھا پانی میں
ایک تو ناؤ تھی وہ کاغذ کی!
گہرا طوفان بھی تھا پانی میں

عین اس وقت اک دعا مانگی
جب ستارہ گرا تھا پانی میں
پھر سے اک گھر بنا کے توڑ دیا
جل پری نے سنا تھا پانی میں
میں پکڑتے پکڑتے ڈوب گئی
مجھ سے کچھ گر گیا تھا پانی میں
وہ جو کچا گھڑا تھا ڈوب گیا
عشق بہتا رہا تھا پانی میں

غزل

یاد جو بھی بنامِ دِل آئے
ہو کے اشکوں سے مشتعل آئے

کوئی آئے نہ دل محلّے میں
کوئی آئے تو مستقِل آئے

بیٹھے بیٹھے کسی کی یاد آئی
بیٹھے بیٹھے کسی سے مِل آئے

جس کا مِلنا محال ہو یا رب
کسی ایسے پہ اب نہ دل آئے

اب ترا کون ہے یہاں نازش!
تو مِلے جس سے اور کِھل آئے

شبیر نازش

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بند دروازہ تھا خالد، یا عبادت گاہ تھی
اس کے دَر پر سارے بے کس، سارے بے گھر سو گئے

غزلیں

سپہ گری کا ہنر بھی سخن وری بھی ہو
میں چاہتا ہوں کہ لشکر بھی ہو پری بھی ہو

گلے لگا کے روانہ بھی کر سکوں اس کو
پلٹ کے آئے تو سازش کی مخبری بھی ہو

زمانہ کاکلِ خیبر ہے اور اس کے لیے
جمال کار وہی ہے جو حیدری بھی ہو

ملائم اتنی کہ چھونے سے نیل پڑ جائے
مبارزت ہو تو آفت ہو بربری بھی ہو

فلک سرائے میں ٹھہری ہوئی ہو میرے لیے
زمین زاد ہو پوشاک سے بری بھی ہو

عقیل عباس

کر رہے تھے یہ التماس اپنے
کبھی گنتی تو کر اداس اپنے

دوستوں کو بھی تہ بہ تہ رکھ دے
جیسے رکھتی ہے تو لباس اپنے

گھر کی اشیا پڑوس کی بلّی
بس یہی ہیں سخن شناس اپنے

خود پہ اتنی فریفتہ بھی نہ ہو
پھول چنتی نہیں کپاس اپنے

اس نے پوشاک آگ میں جھونکی
ہم نے لہرا دیے گلاس اپنے

انہدامِ حویلیِ جاں ہے
پاؤں پھیلا رہی تھی گھاس اپنے

غزل

کاٹ ڈالو زبان ہی تو ہے
خامشی بھی بیان ہی تو ہے

یہ جو ''لا'' ہے یہ گیان ہی تو ہے
بے دھیانی بھی دھیان ہی تو ہے

روز رہتا ہے رابطہ اس سے
درمیاں آسمان ہی تو ہے

ڈھل نہ جائے یقین میں جب تک
ہر عقیدہ گمان ہی تو ہے

ہر پجاری ہے ایک سوداگر
اور معبد دکان ہی تو ہے

ٹوٹتا ہے تو مجھ پہ ٹوٹ پڑے
آسماں سائبان ہی تو ہے

جو بھی ہوں میں کسی کے دم سے ہوں
یہ مرا امتحان ہی تو ہے

طاقچے سے گرا بھی سکتا ہوں
یہ زمیں خاک دان ہی تو ہے

یہ صحیفے ، یہ قصۂ ماضی
سب مری داستان ہی تو ہے

کیوں ہراساں ہو میری سوچوں سے
ایک تازہ جہان ہی تو ہے

ایک سورج بجھا کے کیا لو گے
روشنی کا نشان ہی تو ہے

کیا خطا ہو گئی پرندے سے
صرف اونچی اڑان ہی تو ہے

حشر تک دور ہو ہی جائے گی
عمر بھر کی تھکان ہی تو ہے

میں اسے خود ہی چھوڑ جاؤں گا
جسم کچا مکان ہی تو ہے

وہ بچا لے گا مجھ کو ذلت سے
موت بھی اک امان ہی تو ہے

علمدار حسین

غزل

سُنائی کچھ نہیں دیتا ، تمام بولتے ہیں
عجیب لوگ ہیں جو صُبح و شام بولتے ہیں

بہت سے لوگ ہیں جو بول ہی نہیں سکتے
بہت سے لوگ ہیں جن کے مقام بولتے ہیں

عظیم لوگوں کو تُم گُفتگو سے مت پرکھو
عظیم لوگوں کے دُنیا میں کام بولتے ہیں

ہمیں تو حُکم کی تعمیل کرنا ہوتی ہے
تُجھے یہ کِس نے کہا ہے غُلام بولتے ہیں ؟

ہمیں خریدنے والوں کو دُکھ نہیں ہوتا
ہمارے بیچنے والے وہ دام بولتے ہیں

وہ میر و غالب و اقبال ہوں کہ فیض و فراز
جہاں میں آج بھی کیفی یہ نام بولتے ہیں

محمود کیفی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

میری پلکوں سے اُلجھی ہیں اک پیکر کی قوسیں
آنکھ کا بوجھ بٹائیں کیا روکھی پھیلی تفسیریں

غزلیں

فیض یابی نہیں ممکن تو نظارہ کیوں ہے
دشت کے بیچ گزرتا ہوا دریا کیوں ہے
میری خاموشی بھی اچھی نہیں لگتی اس کو
لب کشائی پہ بھی کہتا ہے کہ بولا کیوں ہے
پہلے احوال یونہی پوچھ لیا موسم کا
اب یہ رونا ہے مرے بعد سہانا کیوں ہے
روز کہتا ہے کہ ہے خواب اداسی کا سبب
تم نے تعبیر سے پہلے اسے دیکھا کیوں ہے
ساری دنیا سے جدا کر کے بھی بے چین رہے
معترض ہے کہ مرے ساتھ یہ سایہ کیوں ہے

فیصلہ کر کے بھی قائم نہیں رہتا تا دیر
خود بدل کر مجھے کہتا ہے کہ بدلا کیوں ہے
سامنے لوگوں کے کیوں رنگ اڑا رہتا ہے
جب خطا ہی نہیں کرتا ہے تو ڈرتا کیوں ہے
خوش نہیں ابر سے کچھ روز سے وہ دریا دل
کہ یہ ویرانے پہ برسا ہے تو برسا کیوں ہے
حاصلِ عمر ہے جب میری کمائی جاذب
کچھ بتائیں کہ یہ تقدیر کا لکھا کیوں ہے

اکرم جاذب

غصے میں نہ اس طرح سے بل کھاؤ..... نہ کھیلو
رکھتے ہو تذبذب میں چلو جاؤ..... نہ کھیلو
مشکل ہو کہ آسان تمہیں جیتنا لیکن
یہ ہو نہیں سکتا ہے کہ تم داؤ نہ کھیلو
کیا فائدہ اس کھیل کا جو پیار گھٹا دے
لازم ہیں اگر طیش، غضب، تاؤ..... نہ کھیلو
خود کھیلنا چاہو تو منانے میں ہو ماہر
میں چاہوں تو بے وجہ ہی گھبراؤ..... نہ کھیلو
میں خوب مزاج اب تو سمجھتا ہوں تمہارا
ممکن ہی نہیں پاس مرے آؤ..... نہ کھیلو

تاخیر مقدم ہو تو سو حیلے بہانے
اچھا جی! ہمیں اور نہ تڑپاؤ..... نہ کھیلو
بن جاتے ہو مجھ سے بھی زیادہ مرے ہمدرد
کہتے ہو کہ لگتے ہیں بہت گھاؤ..... نہ کھیلو
ہر بار نئی چال سے حیران کرو گے
رکھنا ہے یہی مجھ سے جو برتاؤ..... نہ کھیلو
ہر کھیل کے ہوتے ہیں اصول اور ضوابط
خاطر میں نہ جاذب جو انہیں لاؤ..... نہ کھیلو

غزل

اس طرف خوف ہے سناٹا ہے
اس طرف شور مچا کے دیکھوں

اور تو میں سبھی کچھ ہار گیا
اپنی ہستی بھی گنوا کے دیکھوں

ایک دیوار ہے رستہ روکے
ایک دیوار گرا کے دیکھوں

کیا پتہ کوئی ادھر آ نکلے
غار میں آگ جلا کے دیکھوں

تجربہ یوں ہی نہیں آئے گا
کوئی نقصان اٹھا کے دیکھوں

سچ بڑی دیر سے سنتے ہیں لوگ
کیوں نہ افواہ اڑا کے دیکھوں

ہاں کہیں تھم نہ گئی ہو دھڑکن
سینے کو ہاتھ لگا کے دیکھوں

اک عجب بے طلبی ہے احمد
پھر سے ارمان جگا کے دیکھوں

احمد محسود

غزلیں

جاگتے ہم نے شب گزاری ہے
اک اداسی فضا پہ طاری ہے

ہیں گریزاں نجانے کیوں سب ہی
دوستوں کا یہ وار کاری ہے

دعویٰ جنکو ہے ہم سے چاہت کا
انکا لہجہ وفا سے عاری ہے

بھیگا بھیگا ہے شہر کا موسم
دل کی حالت بھی اضطراری ہے

سوچا ہی ہو گا اس نے کچھ اچھا
وہ جو تقدیر کا لکھاری ہے

بھول جانا تمہیں نہیں مشکل
فیصلہ یہ تو اختیاری ہے

ہم نے بھی کب پلٹ کے دیکھا تھا
اسکو بھی اپنی ضد ہی پیاری ہے

نائیلہ راٹھور

حسن اور عشق کی، ایسی تو کرامت لکھنا
جب بھی لکھنا، مرے ہونٹوں پہ محبت لکھنا

آج بھی یاد ہے مجھ کو تو، تری ہر خواہش
اور مری ہاں پہ، درختوں پہ عنایت لکھنا

آن کی آن میں، تاریخ تو سب لکھ ڈالی
اور سب بھول گئے، اس میں صداقت لکھنا

پڑھ لوں میں بھی اسے، جب جب بھی مراجی چاہے
اپنی ہر نظم کے، آخر میں اجازت لکھنا

جیسے بھی وقت گزارے تمہیں، تم کو کی گل!
دل پہ جو بیتی، فقط اس کو قیامت لکھنا

کوکی گل

غزل

کون کہتا ہے یہ زخموں کی پذیرائی ہے
آنکھ تو آنکھ ہے بس ویسے ہی بھر آئی ہے

تم تسلی سے مرے زخم کریدو وحشت
میں ہی ہوتا ہوں یہاں یا مری تنہائی ہے

ایک بھوکے نے اشاروں کی مدد سے طنزاً
کتنے لوگوں کو بتایا کہ مرا بھائی ہے

اب زمانے میں یہ زنجیر ہے پہچان مری
اسکا ممنون ہوں جس نے مجھے پہنائی ہے

ہم تو مائل بہ کرم ہیں تبھی کچھ بولتے ہیں
عشق کے پاس کہاں قوتِ گویائی ہے

دونوں آنکھوں کو لگایا ہے الگ کاموں پر
اک تماشہ ہے یہاں ایک تماشائی ہے

اسد رضا سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تری رُتوں نے ہمیں چاندنی سمیٹنے کو
ہوا سے ہاتھ دیئے، بادلوں سے جال دیئے

غزل

کرنا ہے اک غزال کو قابُو میں طے ہُوا
باندھیں گے نقشِ قیس کو بازو میں طے ہوا

اک چشمِ نیم باز پہ ہم بھی لگا کے شرط
پتھر بنیں گے آنکھ کے جادو میں طے ہوا

تُجھ سا ہو غم گسار تو وعدہ ہے ہم بھی آج
رکھ دیں گے غم سمیٹ کر آنسو میں طے ہوا

ورنہ تو ایک پھول میں ہوتا کہاں علاج
سودا مرا طبیب سے خوشبو میں طے ہوا

نخلِ فلک سے چاند کو لانے کی بات چھوڑ
تجھ کو خرید لائیں گے جگنو میں طے ہوا

دل میں کسی کے پیار کی سرسوں کھلی رہی
اپنا سفر تو ایک ہی پہلو میں طے ہوا

ملتے رہیں گے آپ جو ہم سے تو روز پھول
مہکا رہے گا آپ کے گیسو میں طے ہوا

عاطف جاوید عاطف

غزل

زندگی کٹ رہی ہے وحشت میں
ہجر قسمت بنا محبت میں

عمر گزری ہے یار کے در پر
اک نگاہِ کرم کی حسرت میں

اب تو نقصان ہو گیا یارو
فائدہ کیا کسی وضاحت میں

تھا بھروسہ ہمارا یاروں پر
کوئی آیا نہیں حمایت میں

اب یہاں جھوٹ کی حکومت ہے
کون سنتا ہے سچ عدالت میں

پھول ، جگنو ، ستارے دوست بنے
جب سے آیا ہوں تیری قربت میں

جان تک تجھ پہ وار بیٹھا ہوں
اور کیا چاہیے محبت میں؟

کٹ رہی ہے حیات اے فرخ
آیتِ عشق کی تلاوت میں

سیّد فرخ رضا ترمذی

غزلیں

ڈوبتا ہوں کبھی ابھرتا ہوں
میں تو سورج ہوں پھر نکلتا ہوں

تیری تصویر ابھی ادھوری ہے
تجھ سے مل کر میں رنگ بھرتا ہوں

کیا کسی نے تجھے بتایا ہے
میں تجھے کتنا یاد کرتا ہوں

تُو اکیلا ہے اور سفر مشکل
میں ترے ساتھ ساتھ چلتا ہوں

تُو نے قصداً کبھی نہیں دیکھا
جب ترے پاس سے گزرتا ہوں

میکدے جب سے ہو گئے خالی
تیری آنکھوں سے جام بھرتا ہوں

تا ابد ہے قیام کی خواہش
چار دن میں یہاں ٹھہرتا ہوں

وسیم جبران

اشارے پر اشارہ ہو رہا ہے
مرا دل اب تمہارا ہو رہا ہے

تجھے دیکھا تو بدلا رنگ کیسے
یہ موسم کتنا پیارا ہو رہا ہے

مجھے لہریں بہائے جا رہی ہیں
جدا مجھ سے کنارہ ہو رہا ہے

ہُوا تاریک میرے گھر کا آنگن
مرا آنسو ستارہ ہو رہا ہے

تری آنکھوں کے موتی کہہ رہے ہیں
یہ مت سمجھو خسارہ ہو رہا ہے

شبِ ہجراں ہے، میں ہوں، چاندنی ہے
ترا چھت پر نظارہ ہو رہا ہے

کبھی جبرانؔ دن آئیں گے اچھے
ابھی تک تو گزارا ہو رہا ہے

غزلیں

یوں شروع میں ہی ختم ہوئیں مری مختصر سی محبتیں
سوئے دار لے کے چلی گئیں مری بے خبر سی محبتیں

مری چشم شوق کو تر کیا، مرے سب غرور یہ لے گئیں
مرا سر جھکا کے چلی گئیں، مری بے اثر سی محبتیں

وہ تو عادتاً کسی ایک کا نہ ہوا تو میرا نصیب ہے
مرے اعتبار کو کھا گئیں، مری در بدر سی محبتیں

مرے شہر سے ترے گھر تلک، گیا رائیگاں مرا سب سفر
کبھی ایک رہ پہ نہ چل سکیں، مری منتشر سی محبتیں

مجھے آئنے میں مرا ہی عکس ملا جو سوچ میں غرق تھا
جو ڈبو دے سوچ کے بحر میں، ہوئیں اس بھنور سی محبتیں

شہاب اللہ شہاب

تُو جانتا نہیں ہے جو میرا بھلا ہوا
تو نے جو منہ سے کہہ دیا حرفِ دعا ہوا

اب روگ دل کو عمر کا ہے یہ لگا ہوا
میں سوچتا ہوں تجھ سے تو ملنا سزا ہوا

آلودگی فضاؤں میں یہ کیسی گھل گئی
لگتا ہے جیسے میرا بھی دم ہے گھٹا ہوا

خوشیاں مرے نصیب کی جانے کہاں گئیں
وہ شخص میرے دل سے ہے جب سے جدا ہوا

دنیا کو جو ڈراتا رہا ایک عمر تک
رہتا ہے اب وہ شخص بھی خود سے ڈرا ہوا

ہم نے جہاں پہ پیار کی قسمیں اٹھائی تھیں
ہر شام رکھتا ہوں وہاں دیپک جلا ہوا

کھویا ہوا شہاب ہوں میں اپنی ذات میں
آئے نہ کوئی بھی مجھے اب ڈھونڈتا ہوا

غزلیں

آنکھ جس شخص کے خمار میں ہے
دل اسی شخص کے حصار میں ہے
جب سے دیکھا ہے خواب میں اسکو
دل کی دھڑکن کہاں شمار میں ہے
زور چلتا نہیں مرا دل پر
دل بھلا کس کے اختیار میں ہے
ہو گئی بے نیاز دنیا سے
ایسی تاثیر اس کے پیار میں ہے
پیار آنے لگا ہے خود پر آج
اس نے بولا حسیں تو چار میں ہے

عشق میں ہار کر سمجھ آئی
جیت میں لطف ہے کہ ہار میں ہے
آج بھی ان کے لمس کی خوشبو
پھول میں موسمِ بہار میں ہے
رنگ کر اپنے رنگ میں وہ گیا
اور دل اس کے انتظار میں ہے

سمیرا یوسف

ہنسنے والوں کے ساتھ رونا تھا
میری قسمت میں یوں بھی ہونا تھا؟

ٹوٹنا تھا اخیر دونوں کو
ایک دل دوسرا کھلونا تھا

اشک کیسے نہ پھر بہاتی میں
دل کے داغوں کو بھی تو دھونا تھا

ایک لڑکی تھی ایک لڑکا تھا
ایک چاندی تھی ایک سونا تھا

کیا خبر تھی کہ اس محبت نے
میری پلکوں کو یوں بھگونا تھا

یہ ' سمیرا یقین تھا مجھ کو
اس کو آخر مرا ہی ہونا تھا

غزلیں

کہوں میں کیا تھی وہ منزل شبِ رفتہ جہاں میں تھا
تڑپتے تھے وہاں بسمل شبِ رفتہ جہاں میں تھا

پری پیکر حسیں تھا اور سراپا آتشِ گل تھا
ہوا جاتا تھا بے کل دل شبِ رفتہ جہاں میں تھا

خدا بھی سن رہا تھا انبیا بھی بات کرتے تھے
محمد تھے مہِ محفل شبِ رفتہ جہاں میں تھا

نظر آتا ہے اک پل اور چھپ جاتا ہے پھر اشفاق
وہ منظر دید کے قابل شبِ رفتہ جہاں میں تھا

محمد اشفاق بیگ

خاک ہونے سے اس کو بچایا گیا
راستے میں پڑا پھول اٹھایا گیا

ایک جیسا ہی منظر دکھایا گیا
شام میں صبح کا عکس لایا گیا

ایک ویرانی سی قید تھی آنکھ میں
ایسی حالت میں بھی مسکرایا گیا

روشنی اور اندھیرے جدا تو نہیں
پردۂ شب میں ہی دن چھپایا گیا

ان گنت رنگ ایجاد کرنے پڑے
پھر خلا میں زمیں کو بنایا گیا

مہر علی

غزلیں

کوئی شعلہ ' بیان میں کب تھا
جو ہوا وہ گمان میں کب تھا

جس نے دنیا مری سجائی تھی
چاند وہ آسمان میں کب تھا

جس کے ہم خود شکار ہو بیٹھے
وہ شکاری مچان میں کب تھا

بھولی صورت پہ مر مٹے ہم تو
کوئی شیرا زبان میں کب تھا

اپنی قسمت سے چل گئی ورنہ
کوئی سودا دکان میں کب تھا

ہم ضیافت سجا کے بیٹھ گئے
کوئی مہماں مکان میں کب تھا

آ گیا باز کیوں بھلا طالب
دل کا پنچھی اڑان میں کب تھا

میرے الفاظ میں زباں رکھ دو
بدگمانی میں کچھ گماں رکھ دو

لاکھ اپنے ہو تم مرے پھر بھی
کوئی پردہ تو درمیاں رکھ دو

پھر پلٹ کر ادھر ہی آنا ہے
اپنے رستے میں کچھ نشاں رکھ دو

دل کا مالک تمہیں بنانا ہے
جس جگہ جا ہو تم جہاں رکھ دو

اپنے رب سے غریب کہتا ہے
لامکانی میں اک مکاں رکھ دو

جرم ثابت اگر نہ ہو پائے
کوئی جھوٹا ہی اک بیاں رکھ دو

دل جلا دوں گا آج میں طالب
آگ نہ ہو تو کچھ دھواں رکھ دو

طالب ہاشمی

غزل

بدل جائے گا وحشت کا نصاب آہستہ آہستہ
یہاں پہ آئے گا ہر انقلاب آہستہ آہستہ

کسی کے ہاتھ عجلت میں کہاں آتے ہیں دیوانے
انہیں تسخیر کرتے ہیں جناب آہستہ آہستہ

نگاہیں کتنے برسوں کا سفر طے کر کے آتی ہیں
اترتا ہے حسینوں کا حجاب آہستہ آہستہ

کسی پہ حکمرانی کے ضوابط بھی تو ہوتے ہیں
تجھے ہم ہوں گے صاحب دستیاب آہستہ آہستہ

کبھی تنہا جزیروں پہ کبھی یہ دشت کے باسی
ترے مے خوار ہوتے ہیں خراب آہستہ آہستہ

مجھے عجلت نہیں کہ خواہشیں میری مکمل ہوں
میں کھولوں گا تمناؤں کے باب آہستہ آہستہ

دکھا کے ماہتابِ حسن کا جلوہ نگاہوں کو
کیا جائے ہمارا احتساب آہستہ آہستہ

مستحسن جامی

غزل

اب کے کچھ اور سلسلہ ہوگا
یعنی اس بار کچھ نیا ہوگا

کوئی لمحہ اگر جدا ہوگا
وہ مرے پاس بھی رہا ہوگا

بادلوں سے دھواں برستا ہے
بارشوں سے کوئی جلا ہوگا

یہ فضائیں صدا لگاتی ہیں
کوئی ان کا بچھڑ گیا ہوگا

منتظر مدتوں سے بیٹھے ہیں
اس نے وعدہ کوئی کیا ہوگا

ذائقہ اس لیے لبوں پر ہے
وہ مری روح تک گیا ہوگا

میری تصویر جب بنی ہوگی
درد منظر سے پھوٹتا ہوگا

وقت کی نبض روک لی اس نے
وقت اس سے بھی تو گیا ہوگا

حیف، کن وسعتوں میں بدلا ہے
یہ کسی کا مکاں رہا ہوگا

زیبا نور

غزل

بوئے خلوص ، عظمتِ انسان کھینچ کر
سینے سے کون لے گیا ایمان کھینچ کر

کرتا ہے اُن کے رِزق کا وہ اہتمام خود
لاتا ہے گھر ہمارے جو مہمان کھینچ کر

اُن کا عجب یہ طرزِ نصیحت تو دیکھیے
سمجھا رہے ہیں مجھ کو گریبان کھینچ کر

لگتا ہے اِن سے اپنا تعلق ضرور ہے
لے آتے ہیں جو دشت و بیابان کھینچ کر

اے عقلِ خام تُو کبھی آ رُوبرو مرے
تیری خبر میں لوں گا ترے کان کھینچ کر

شاید کوئی رَمق ہو محبت کی قلب میں
لے آیا ہے مجھے یہی اِمکان کھینچ کر

پروردگار ایسا مسیحا زمیں پہ بھیج
لے جائے اِس وطن سے جو بحران کھینچ کر

یوں سوئے حشر لاؤ کہ لاتے ہیں جس طرح
دربار میں اسیر کو دربان کھینچ کر

اُس شخص کا لگاؤ خیالی کوئی سراغ
جو تَن سے لے گیا ہے دل و جان کھینچ کر

زبیر خیالی

غزل

اہلِ مسند کا یہ دستور بھی ہو سکتا ہے
بے ضمیری نیا منشور بھی ہو سکتا ہے

جلد بازی نہ کرو در سے اُٹھانے کی مجھے
یہ دوانہ تمہیں منظور بھی ہوسکتا ہے

بے وفا ہی کہیں اُس کو، یہ ضروری تو نہیں
جانے والا کبھی مجبور بھی ہوسکتا ہے

تم جسے ڈھونڈتے پھرتے ہو زمانوں میں، وہ
اِن زمانوں سے بہت دور بھی ہوسکتا ہے

یہ ضروری تو نہیں، نام ونشاں تک نہ رہے
دل ترے ہجر سے مشہور بھی ہوسکتا ہے

طائرِ دل کے نکل آئے ہیں اب پر طاہر
سو کسی وقت یہ مفرور بھی ہو سکتا ہے

بے یقینی کا یہ عالم ہے کہ اب ساتھ کھڑا
دوست کے بھیس میں ناسور بھی ہوسکتا ہے

محمد طاہر کمال جنجوعہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لہُو کی دھار نے تن روشنی میں ڈھال دیئے
سَروں کے ساتھ ہوا میں دیے اُچھال دیئے

غزلیں

ابھی تک مونج کا تاؤ نہیں ہے
روایت کا تو یہ بھاؤ نہیں ہے

گھڑی تحفے میں دینی ہے کسی نے
کلائی پر کوئی گھاؤ نہیں ہے

منوں گندم پڑی ہے گھر میں لیکن
فقیروں کے لیے پاؤ نہیں ہے

محبت بٹ رہی تھی سب میں لیکن
مجھے اس نے کہا' جاؤ نہیں ہے

کناروں کا بہت سنتے تھے کاشف
یہاں پر بھی کوئی ناؤ نہیں ہے

کاشف واصفی

پہنا دیا ہے جب سے یہ تم نے لباسِ غم
کتنی اذیتوں سے ہوئے روشناس ہم

تیرے فراق میں, تری یادوں میں, سوگ میں
رویا ہوں اس قدر مجھے دکھنے لگا ہے کم

شاداب تھی یہ زندگی برباد ہو گئی
ہائے رے تیرا رنج یہ ہائے ترا الم

ہر چیخ ہر پکار جب بے سود ہو گئی
چپ سادھ لی زبان نے چلنے لگا قلم

صحرا بدن تو سانس ہے تپتی ہوئی فضا
ہیئت مری بدل گئے ہستی کے پیچ و خم

دنیا غموں کا گھر ہے یہ شہ زیب ہاشمی
چپ چاپ کر وصول تو جھے کے سب ستم

شاہ زیب ہاشمی

غزل

تجھ سے گر گفتگو نہیں کرتے
شعر کی جستجو نہیں کرتے

زندگی میں جو تو نہ شامل ہو
خود کی بھی آرزو نہیں کرتے

تجھ سے شکوے تو ہم کو لاکھوں ہیں
بس ترے رو برو نہیں کرتے

کیسے جائیں گے لوگ جنت میں
خود کو جو سرخرو نہیں کرتے

تجھ کو چھونا تو اور پہلو ہے
ذکر بھی بے وضو نہیں کرتے

میرے پہلو میں درد رہتا ہے
مجھ سے وہ گفتگو نہیں کرتے

بس تمہاری ہی آرزو ہے وحید
اور کوئی جستجو نہیں کرتے

وحید احمد قادری

غزل

ہنر اپنا سبھی نے آزمانے کے لیے صاحب
دھرے ہیں چہرے خانوں پر دکھانے کے لیے صاحب

پُرانی سب کتابیں لوگ اکثر بیچ دیتے ہیں
پرانے وقت کی یادیں بھلانے کے لئے صاحب

ہمارے ہاتھ کا لقمہ بھی ہم سے اس نے چھینا ہے
ہمارا صبر شاید آزمانے کے لئے صاحب

چمن سارے کا سارا آپ نے ویران کر ڈالا
بس اپنا صحن پھولوں سے سجانے کے لئے صاحب

سجا رکھا ہے دامن میں نے اپنا غم کے پھولوں سے
کوئی تازہ بہ تازہ زخم کھانے کے لئے صاحب

ملاوٹ سے ہمیشہ پاک رکھتا ہوں میں لہجے کو
فقط معیار کچھ اپنا بنانے کے لئے صاحب

اگر گھر آئے دشمن اس کو بھی عزت سے ملتے ہیں
بھلی رسمیں بزرگوں کی نبھانے کے لئے صاحب

ہمارے ہاتھ کاٹے وقت کے سلطان نے ساگر
ہمیں اوقات اپنی پھر دکھانے کے لئے صاحب

صدام ساگر

غزل

کوئی اک شام ، ہم فقیروں میں
کر لے آرام ، ہم فقیروں میں

جذب و مستی میں تو بھی ڈال دھمال
اور ، کما نام ، ہم فقیروں میں

جا کہیں کھول اور دکاں اپنی
تیرا کیا کام ، ہم فقیروں میں

روح تک تو پہنچ نہیں پاتا
عشق ، ناکام ، ہم فقیروں میں

وہ دلوں پر ہی راج کرتا ہے
جو ہو بدنام ، ہم فقیروں میں

مے سے مشہور ہے کہیں ، امجد
آنکھ کا جام ، ہم فقیروں میں

امجد خان تجوانہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اندھیر رہ نہیں سکتا سدا خدائی میں
خدا گواہ بنے گا مری صفائی میں

غزلیں

یہ کاروبار ہزاروں کے ساتھ چلتا ہے
ہمارا عشق تو ساروں کے ساتھ چلتا ہے

کسی جگہ بھی اکیلا نہیں دکھائی دیا
وہ شخص کتنے سہاروں کے ساتھ چلتا ہے

تمھارے ساتھ مرا بے دلی کا رشتہ ہے
ہنسی مذاق تو یاروں کے ساتھ چلتا ہے

ہم آسمان پہ اُڑتے ہوئے پرندے ہیں
ہمارا عکس کناروں کے ساتھ چلتا ہے

رمزی آثم

کوئی ملال نہ وحشت خراب کرتی ہے
مرا مزاج محبت خراب کرتی ہے

پڑا ہوا ہوں میں گم ناميوں کی دلدل میں
بڑے بڑوں کو یہ شہرت خراب کرتی ہے

پھر ایک روز تجھے چھوڑنا پڑا دنیا
فقیر کو تری قربت خراب کرتی ہے

اسی لیے میں بہت دور ہوں محبت سے
کہ یہ بلا مری عزت خراب کرتی ہے

بہت اداس ہے کوئی یہ پھول لیتے ہوئے
کسی کا رزق مزاروں کے ساتھ چلتا ہے

کوئی کسی کو دکھائی نہیں دیا اب تک
یہ سب نظام اشاروں کے ساتھ چلتا ہے

کوئی بھی اپنی خوشی سے نہیں خراب ہوا
کہ آدمی کو ضرورت خراب کرتی ہے

خریدنا تو مجھے اس نے ہے نہیں آثم
وہ پوچھ کر مری قیمت خراب کرتی ہے

غزلیں

رات، خود کو جگا کے بیٹھ گئے
سامنے، ہم خدا کے بیٹھ گئے
اپنے سائے سے جب ہوئی وحشت
ہم دیے کو بجھا کے بیٹھ گئے
اس سے پہلے کہ ہم بکھر جاتے
ٹیک خود سے لگا کے بیٹھ گئے
دل زمانے میں جب لگا نہ کہیں
ماں کے پہلو میں جا کے بیٹھ گئے
گھر کی تقسیم اس طرح ہوئی ہے
صرف رشتے بچا کے بیٹھ گئے

بات میری نہ اُس نے مانی جب
دل میاں منہ بنا کے بیٹھ گئے
اُس نے روکا تھا بولنے سے ہمیں
اور ہم مسکرا کے بیٹھ گئے
اُس کے لہجے کی تلخیوں کے عوض
خون اپنا جلا کے بیٹھ گئے
محوِ حیرت ہوئے سبھی اکمل
وہ، مرے پاس آ کے بیٹھ گئے

اکمل حنیف

بے سبب تو نہیں ہم اشک بہانے والے
یاد آئے ہیں بہت چھوڑ کے جانے والے
یوں ترے رزق میں تخفیف بھی ہو سکتی ہے
سوچ لے گھر سے پرندوں کو اڑانے والے
تُو بتا لوگ بھلا کس کا اڑاتے ہیں مذاق
عیب کے ساتھ مری ذات بنانے والے
بھول جاتا ہوں مسائل میں زمانے کے سبھی
اک غنیمت ہیں مرے دوست پرانے والے
یار! باتوں پہ اگر دھیان نہیں دو گے تم
جاؤ، پھر ہم بھی نہیں خواب سنانے والے

میں غلط تھا جو تمھیں یار سمجھنے لگا تھا
ورنہ سب رنگ تھے تم میں بھی زمانے والے
کر چکے باپ کی تدفین ملازم گھر کے
لوٹ پائے نہیں پردیس کو جانے والے
آج میں ایسی بلندی پہ کھڑا ہوں اکمل
سر اٹھا کر مجھے تکتے ہیں گرانے والے

غزل

یہ شہر شہر عجب قحط آب و دانہ پڑا
چھتوں پہ بیٹھے پرندوں سے منہ چھپانا پڑا

تھی اس کے جسم پہ چھینی گئی ردا کی شکن
تماشا کرنا پڑا آئنہ دکھا نا پڑا

لکیر کھینچی تھی اس نے تعلقات کے بیچ
مجھے بھی اپنے لیے دائرہ بنانا پڑا

بنا رہا تھا میں کاغذ پہ گھر کی دیواریں
پھر اس کے بعد وہ کاغذ مجھے جلانا پڑا

عجب تعلقِ خاطر تھا دو دلوں کے بیچ
نہ کچھ گھٹانا پڑا اور نہ کچھ بڑھانا پڑا

پڑی ہوئی تھی گرہ کی طرح مری تاریخ
کھلی تو پھر مجھے کیا کیا نہیں بھلانا پڑا

فراتِ عصر پہ قبضہ تھا اور بچوں کو
وہ پیاس تھی کہ مجھے زہر تک پلانا پڑا

وہ دن بھی دیکھ لیے وضع داریوں نے کہ جب
گرے پڑے ہوئے لوگوں کو منہ لگانا پڑا

انا کے بت میں محبت شگاف ڈالتی ہے
بلایا پیار سے اس نے تو مجھ کو جانا پڑا

خیالِ خاطرِ احباب رکھنا پڑتا ہے
وہ لڑ کھڑایا تو مجھ کو بھی لڑ کھڑانا پڑا

ممانعت تھی خبردار اب جو رویا کوئی
جو رو رہے تھے انہیں قہقہہ لگانا پڑا

میں سب سے ہٹ کے چلا اور نکل گیا آگے
پھر اس کے بعد جو پیچھے مرے زمانہ پڑا

کوئی سرائے نہ جائے اماں سفر میں پڑی
پڑا تو سیدِ لولاک کا گھرانہ پڑا

جاوید صبا

غزل

اقرا انصاری

بیچ دریا نہ لے کے جاؤ مجھے
گھورتی ہے بھنور میں ناؤ مجھے

چاہتی ہوں کہ تم بھلاؤ مجھے
اب بجھانا ہے یہ الاؤ مجھے

دل کو درکار ہے دوائے غم
اپنی آواز تو سناؤ مجھے

پھر گلے کرتے رہنا بے شک تم
پہلے سینے سے تو لگاؤ مجھے

تم نے چھوڑا تھا عادتاً مجھ کو
اب مشقت کرو، کماؤ مجھے

دھڑکنوں کی صدائیں سن پاؤں
اس قدر اپنے پاس لاؤ مجھے

میری برسوں کی نیند پوری ہو
اپنی بانہوں میں یوں سلاؤ مجھے

اس سے پہلے کہ سچ میں رونے لگوں
جھوٹ بولو ذرا، ہنساؤ مجھے

غزل

چلو کسی کو تو آئی ہے اِس کمی کی سمجھ
جو گم ہوئی ہے کہانی سے اُس کڑی کی سمجھ

یہ کوہ قافِ تمنا تلک خودی کی ڈگر
ہزار کوس پہ آتی ہے اِس پری کی سمجھ

ستارے ٹوٹ کے روئے یہ بین کرتے ہوئے
شبِ سیاہ کو آئی نہ روشنی کی سمجھ

کسی ہرے کی تمازت سے آگ پا لیتا
بدن کے زرد کو آتی جو آتشی کی سمجھ

یہ ایک رنج مگر آگہی کے ساتھ مِلا
ہمیں گزار کے آئی بُری گھڑی کی سمجھ

فرح رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ظاہر نہ کسی کور نظر پر بھی ہُوا میں
کیا فرق پڑا، تجھ پہ کُھلا، یا، نہ کُھلا میں

غزلیں

حیرت ہے اس کی آنکھ میں کیونکر ملال تھا
میرا تو ایک صرف محبت سوال تھا

گرچہ تمام شہر کی آنکھوں میں آگ تھی
لیکن جو ایک شخص محبت مثال تھا

سنتی تھی مجھ کو شہر کی لایعنی گفتگو
اور اس پہ آگہی بھی انوکھا وبال تھا

پھر یوں ہوا کہ اس کی توجہ طلب نہ تھی
بے اعتنائیوں پہ عجب دل نہال تھا

مانے گا کون دیکھ کے رستا ہوا لہو
اس دستِ با ہنر پہ لکیروں کا جال تھا

افسردگی کے خوف میں مرنا تھا بزدلی
سب الجھنوں کے ساتھ ہی جینا کمال تھا

باہر شکست و ریخت کو کیسے سنبھالتا
اندر کے انہدام سے اتنا نڈھال تھا

گرچہ بہت سے چاند شریکِ سفر رہے
لیکن وہ ایک قطبی ستارہ کمال تھا

جب ساری کائنات کی دھڑکن رکی رہی
تب روشنی سے پار نکلنا کمال تھا

میں نے غزل کہی تو کھلے چاہتوں کے پھول
جب شہرِ کم سخن میں محبت کا کال تھا

پھر شب کی ظلمتوں کو مجھے چیرنا پڑا
مہتاب کب تلک مرے رستے اجالتا

کیا دل کی دھڑکنیں تھیں لکیروں سے منسلک
کیا تیرا دیکھنا بھی ستاروں کی چال تھا

اس وقت ہم نے شعر کہے، ماہیے لکھے
جب شہر میں سخن بھی بہت خال خال تھا

محمد نور آسی

غزل

شبِ اداس میں نصرت کو گنگناتے ہوئے
وہ مجھ کو یاد کرے گا دیا جلاتے ہوئے

اسے یقین بھی تھا کہ میں جان دے دوں گی
مگر وہ ہنستا رہا مجھ کو آزماتے ہوئے

یہ بات اہلِ خرد جانتے ہیں اچھے سے
بہت سی راتیں لگیں ایک دن بناتے ہوئے

اسی کی راہ میں روشن چراغ ملتے ہیں
ستارہ ڈوب گیا تھا جو جھلملاتے ہوئے

میں اس کا خواب تھی لیکن یقیں کی حالت میں
مجھے پکار رہا تھا وہ لڑکھڑاتے ہوئے

رخسانہ سمن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دستِ ہوا سے پرتوِ ادراک ہو گئے
بادل بکھر کے دامنِ صد چاک ہو گئے

غزل

بے یقینی کے تیز دھارے پر
چل پڑا ہوں ترے سہارے پر

عشق پہنچا خدا کی بستی میں
جل گئے ہیں مگر ہمارے پر

اس نے دریا سے دوستی کر لی
اور بیٹھا رہا کنارے پر

سب کو اپنی پڑی ہوئی ہے یہاں
کون روتا ہے غم کے مارے پر

اے! مرا کچھ نہ سوچنے والے
جان حاضر ترے اشارے پر

حشر برپا ہو جب شبستاں میں
آگ لگتی ہے تب ستارے پر

اس کی آنکھوں میں کیا نمی اتری
اوس پڑنے لگی منارے پر

ارسلان ساحل

غزل

درد میں تھیں راحتیں اک شخص کے اعجاز سے
دھوپ میں تھیں بارشیں اک شخص کے اعجاز سے

سبز تھیں سب حسرتیں اک شخص کے اعجاز سے
خواہشیں تھیں مشعلیں اک شخص کے اعجاز سے

نور کا سیلاب تھا جو آنکھ خیرہ کر گیا
گم ہوئیں سب صورتیں اک شخص کے اعجاز سے

خواب میں ملتا رہا جب تک نہیں مجھ سے ملا
حسن میں تھیں وسعتیں اک شخص کے اعجاز سے

روشنی میں ڈھل گیا اس ہونٹ کو جو چھو لیا
حرف میں تھیں رفعتیں اک شخص کے اعجاز سے

خلوتوں میں گفتگو اور جلوتوں میں خامشی
طے ہوئیں یہ منزلیں اک شخص کے اعجاز سے

دل تو تھا میرا مگر اس زندگی کے ساز پر
رقص میں تھیں دھڑکنیں اک شخص کے اعجاز سے

زندگی تک ہار دی اک بے وفا کے نام پر
ہم نے پائیں ہمتیں اک شخص کے اعجاز سے

نیند بھی اس کی عطا تھی، خواب بھی اس کے طفیل
ہو گئیں یہ نسبتیں اک شخص کے اعجاز سے

تو بشیر احمد حبیب اب وقت سے آزاد ہے
رک گئی ہیں ساعتیں اک شخص کے اعجاز سے

بشیر احمد حبیب

غزل

ڈھونڈ ملنے کا کچھ بہانا سا
یار موسم ہے کیا سہانا سا

اب وہ نظریں بدل چکے ہم سے
جن سے تھا اپنا دوستانا سا

دل خاموش سُن کے رویا ہے
تیری چپ کا عجب ترانا سا

دوریاں مٹ سکی نہ دونوں میں
بیچ حائل تھا اِک زمانا سا

تیز آندھی کی نذر کرنے کو
اک بنایا ہے آشیانا سا

بات ہے خاص گر کوئی سمجھے
گرچہ لہجہ ہے عامیانہ سا

خود کو رکھا سمیٹ کر شاہد
جیسے ہو مختصر فسانا سا

رانا محمد شاہد

غزلیں

سفر کی شرط پہ جو بھی بنی گزاری ہے
بدل بدل کے جگہ زندگی گزاری ہے

بلاشبہ کئی حصوں پہ مشتمل تھی یاد
طویل وقت میں تیری کمی گزاری ہے

کوئی سلاخ نشیں سر اٹھا کے دیکھے گا
دریچے سے کسی نے روشنی گزاری ہے

کسی اضافے کی مجھ میں نہیں ہے گنجائش
بدن سمیٹنے میں زندگی گزاری ہے

پکارنا کسی کا حکم لگ رہا تھا مجھے
بس ایک تنکے پہ میں نے ندی گزاری ہے

زمان کیسا چمکدار ہے ہنر تیرا
کہ تو نے خشک بدن سے نمی گزاری ہے

دانیال احمد زمان

کیوں گفتگو میں لہجۂ تر لگ نہیں رہا
باتوں میں تیری آج اثر لگ نہیں رہا

دو چار میل میں تری جانب چلوں مگر
دو چار میل کا یہ سفر لگ نہیں رہا

میں خوبرو جوان تھا یہ مانیے جناب
تصویر دیکھ لیجیے گر لگ نہیں رہا

خونِ جگر پلا دیا اس کو مگر ابھی
جیسا میں چاہتا ہوں شجر لگ نہیں رہا

جب سے مکینِ قلب نے چھوڑا ہے اپنا گھر
دل مثلِ ریگ زار ہے، گھر لگ نہیں رہا

تیرے بغیر شہر میں ہر ایک سے منیر
میں دل لگا رہا ہوں مگر لگ نہیں رہا

منیر انجم

غزلیں

مرے گمان میں اپنا قیاس رہنے دے
میں ناشناس ہوں بس ناشناس رہنے دے

کسی کے سر کا دوپٹہ بنانا چاہتا ہوں
"تُو میرے کھیت میں اتنی کپاس رہنے دے"

نہیں ہے کچھ بھی مرے پاس اب تو تیرے سوا
مرے بدن پہ خدایا لباس رہنے دے

مری اداسی کا حل ہی نہیں ہے دنیا میں
اکیلا چھوڑ مجھے اور اداس رہنے دے

مجھ ایسے لوگوں کو تیری بہت ضرورت ہے
مجھ ایسے لوگوں کو تُو اپنے پاس رہنے دے

مزمل ادریس

مصرعے کہہ لینے سے کیا وہ میرا ہو گا؟
چاند جسے تکتا ہو سوچو کیسا ہو گا

واپس آ ہی جاتا ہو گا آنے والا
پر دل کوئے جاناں میں رہ جاتا ہو گا

اب اُس کی آنکھوں سے اشک نہیں گرتے ہیں
رونے والا آخر کتنا رویا ہو گا

میں اُس کو اب تک چھونے کی کوشش میں ہوں
کس کا جانے وہ سارے کا سارا ہو گا

آگے چاہے لاکھ کھڑے ہوں مرحب جیسے
ٹکڑے کر دے گا جو حیدر والا ہو گا

کارو بار کبھی مل کر مت کرنا سعدی
یا اُس دن سے ڈرنا جس دن گھپلا ہو گا

سعد سعدی

غزلیں

ہمیں وفا کا صلہ ملا ہے، ہمارے سر پہ قضا کھڑی ہے
تمہاری خاطر کہیں گے ہنس کے فراق گرچہ سزا کڑی ہے

اداس لمحوں کی بیتی باتیں جو سن سکو تو سنائیں تم کو
ہماری سنتے نہیں ہیں اپنے، ہو غیر پھر تمکو کیا پڑی ہے

ہیں جن کی خاطر یہ درد جھیلے، بری نظر سے بچا کے رکھا
وہ چاند چہرے بچھڑ رہے ہیں، دعا کرو یہ کٹھن گھڑی ہے

انا کے سارے بتوں کو توڑا، روایتوں کی فصیل توڑی
خدا کرے وہ رہے سلامت، ہر ایک لمحہ دعا پڑھی ہے

ہر ایک پل ہم پہ ظلم کرنا، یہ آرزو انکا مشغلہ ہے
خدا سے مانگیں گے اور کوئی، خدا کی ہستی بہت بڑی ہے

خالق آرزو

تیرا اقرار بھی اَب مجھ کو گوارا ہے کہاں
قرض میں نے تری چاہت کا اُتارا ہے کہاں

میں ترے وصل سے پہلے جو گزار آیا ہوں
جانے وہ دور مرے دل نے گزارا ہے کہاں

میری پسپائی نہیں ہے مرے لہجے کی تھکن
حوصلہ میں نے، زمانے! ابھی ہارا ہے کہاں

ڈھونڈتے ڈھونڈتے بے حال ہوا جاتا ہوں
میرے مولا! مری قسمت کا ستارا ہے کہاں

اے مرے دوست! کہاں ڈھونڈنے جاؤں تجھکو
کیا خبر آج مجھے تو نے پکارا ہے کہاں

آرزو! میری نگاہوں کو طلب ہے جس کی
میرے حصے کا وہ منظر، وہ نظارہ ہے کہاں

غزل

ہونٹوں پہ سُخن کے فیتے ہیں
سینے میں دبائے شُعلے ہیں

ہم اُن کو دیکھ کے جیتے ہیں
وہ اور کسی پہ مرتے ہیں

مجبور ہیں اُن کے آگے ہم
جی ہی جی میں سسکتے ہیں

وہ اور طرح کی باتیں اور
ہم اور طرح کی کرتے ہیں

کچھ بدخواہوں کی آنکھوں میں
ہم مثلِ خار رڑکتے ہیں

اُس شوخ حسیں کے دونوں
عارضؔ پہ گلاب کھلتے ہیں

سرفراز عارض

دو غزلہ

آپ سے محوِ گفتگو ہم تھے
آپ ہی تھے کہ چار سُو ہم تھے

اشک ٹپکا تو لہلہا اٹھے
زخم چٹخا تو مُشکبو ہم تھے

جگمگاتا تھا نشاط مندوں کا
ایک زحمت کشِ سبو! ہم تھے

اُس طرف حسبِ آرزو کیا تھا؟
جس طرف حسبِ جستجو ہم تھے

ایک دروازہ کھل گیا ورنہ
در بہ در ہم تھے، کُو بہ کُو ہم تھے

کرتے رہتے تھے شعبدہ بازی
لفظ چیلے تھے اور گُرو ہم تھے

زندگی قامتِ عروساں تھی
اور گریبانِ بے رفو ہم تھے

کون تھا اِس نگار خانے میں؟
آپ تھے یا کبھو کبھو ہم تھے

زخم تصویر کر رہا تھا کوئی
اور کاغذ پہ ہُو بہو ہم تھے

آبِ خنجر کے رو برو ہم تھے
تشنہ لب تھے کہ بُو بہ بُو ہم تھے

ہم نے دی تھی اذانِ عیدِ وصال
تیر کھا کر بھی خوش گلو ہم تھے

صحنِ مقتل تھا یا مصلّیء رنگ
ایک سجدے میں سرخ رو ہم تھے

تیغ سے پوچھ یا نماز سے پوچھ!
بے وضو تھے کہ با وضو ہم تھے

کیسا لشکر؟ کہاں کی تنہائی؟
جا بہ جا ہم تھے! دو بدو ہم تھے

چشمِ زنجیر! تُو نے دیکھا نہیں
ایڑیوں تک لہو لہو ہم تھے

عارف امام

غزل

اس لیے آپ کامیاب نہیں
آپ کی آنکھ محوِ خواب نہیں

کاش سب کی سمجھ میں آجائے
زندگی خود کوئی کتاب نہیں

چند خوشیاں ہیں نوٹ کرلی ہیں
اور دکھوں کا کوئی حساب نہیں

زندگی بھر مجھے ضرورت ہے
اور تو پل کو دستیاب نہیں

کچھ تو دل کی رضا بھی شامل تھی
عشق یک طرفہ انتخاب نہیں

اس لیے نیند سے نہیں بنتی
اس کے دامن میں کوئی خواب نہیں

پھر یہ خوشبو کہاں سے آتی ہے
اس کا چہرہ اگر گلاب نہیں

محمد علی ایاز

غزل

اپنے ہر خواب کو پلکوں پہ سجانا ہے مجھے
بعد مرنے کے بھی زندہ نظر آنا ہے مجھے

منسلک خواب ہیں لاکھوں کہ ہزاروں مجھ سے
آخری بیٹا ہوں، ہر خواب نبھانا ہے مجھے

شام ہوتے ہی میں لوٹ آؤں گا پیاری وحشت
مجھ کو رخصت دو، ابھی رزق کمانا ہے مجھے

شہرِ آباد کے فانوس جلا کر سوچا
اپنے گاؤں بھی دیا ایک جلانا ہے مجھے

ماں ترے آگے ہنسی میری سدا گونج اٹھے
تیری دہلیز پہ ہر اشک چھپانا ہے مجھے

بے وفا لوٹ کے آیا ہے ارے کیا کہنے
وہ یہ کہتا ہے کہ اب پیار سنانا ہے مجھے

زندگی ختم ہو اس بات کا ڈر کوئی نہیں
موت منزل ہے مجھے، قبر ٹھکانہ ہے مجھے

وقت نے جنبشِ دگردش کا فسوں وہ باندھا
اب تو میرا ہی کہا ایک فسانہ ہے مجھے

رات منڈلاتے رہے چور ہماری بستی
اپنے سوئے ہوئے لوگوں کو جگانا ہے مجھے

جاگ جاؤ یا بنو رات اندھیری کے سفیر
ایک عنوان یہی سب کو بتانا ہے مجھے

شام کے وقت ملو، تم کو اگر فرصت ہو
ڈوبتا دل کہ شفق، تم کو دکھانا ہے مجھے

یہ جو بے قاعدہ انسان بنا پھرتا ہے
آج عثمان کو کچھ عشق سکھانا ہے مجھے

عثمان حنیف

غزل

عشق کے روگ میں حسیں جاگے
سوئے تھے ہم کہیں ، کہیں جاگے

ابھی ممکن نہیں بغاوت ہو
ہم ابھی نیند سے نہیں جاگے

خوف سے رنگ اُڑ گیا سب کا
سانپ جب زیرِ آستیں جاگے

دیکھ سورج ابھی نہیں نکلا
کیسے ممکن ہے مہ جبیں جاگے

آؤ آواز اک اُٹھاؤ سب
جس سے دھرتی کا ہر مکیں جاگے

جن کی ہر بات میں سیاست ہو
اُن پہ کیسے مرا یقیں جاگے

شہر والوں کو کیا خبر عابد
کب تلک دشت کے مکیں جاگے

عابد معروف مغل

غزل

بس ترے یونہی مسکرانے سے
ہنس پڑا میں بھی اس بہانے سے

تیر خود ہی ہدف تلک پہنچا
میں رہا منحرف نشانے سے

موت کا وقت تو نہیں تھا ابھی
موت آئی ہے تیرے جانے سے

آبلے پڑ گئے ہیں پاؤں میں
خوابوں کی کشتیاں جلانے سے

درد کچھ اور بڑھ گیا میرا
کیا ملا مجھ کو آزمانے سے

قلب عباس قلبی

زندگی موت ہی بناتی ہے
زندگی کب بنی بنانے سے

مجھ سے سارا زمانہ ہے قلبی
میں تو ہرگز نہیں زمانے سے

غزل

سہولت مرنے کی، جینے کا چارہ، کچھ نہیں چھوڑا
تمہاری دوستی نے تو ہمارا کچھ نہیں چھوڑا

سرِ محفل تمہارے ظلم کیا گن گن کے بتلائیں
فقط اتنا ہی دیتے ہیں اشارہ، کچھ نہیں چھوڑا

تری جادوئی بستی میں ہوئے پتھر نہیں، لیکن
ہمیں جس نے بھی پیچھے سے پکارا کچھ نہیں چھوڑا

ہماری زندگانی ہے بدن کوئی طوائف کا
کہ جس کو نائکہ نے جب سنوارا، کچھ نہیں چھوڑا

محبت یوں تو اچھی ہے مگر نجم اک رویے نے
ہمیں اس تجربے سے یوں گزارا کچھ نہیں چھوڑا

جی اے نجم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چشم نم جن پہ تھے اہلِ دل ، اہلِ غم
آج ان بستیوں کے نشاں بھی نہیں

غزل

نگاہ اٹھی خد و خالِ دلنشین کی سمت
گمان و وہم بھی چلنے لگے یقین کی سمت

وہ جانتا تھا کہ یوں بات مان لیتا ہوں
بلا رہا ہے بڑے پیار سے کمین کی سمت

مجھے بھی عشق کے اس قاف تک پہنچنا ہے
ابھی تو عین سے نکلا ہوا ہوں شین کی سمت

میں سب سے شہر میں شکنیں چھپائے پھرتا تھا
پھر ایک شخص نے دیکھا مری جبین کی سمت

نبیِ رحمتِ عالم ، علی ، حسین کی ماں
بروزِ حشر یہ امت بڑھے گی تین کی سمت

ستارے ، چاند ، فلک ، کہکشاں خدا کی قسم
سبھی جھکائے گئے ہیں مری زمین کی سمت

اویس عابس

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مَیں کُل کا آدمی ہُوں ، مجھے کُل پہ ٹال دے
اَے دن! مجھے زوال کی حَد سے نکال دے

غزلیں

تجھے کیا دکھاؤں کہانی کی سی ڈی
مرے ذہن میں ہے جوانی کی سی ڈی

ہے کیسے بنایا محمد علی نے
وطن دیکھ پائے جو، بانی کی سی ڈی

مرے ذہن و دل میں سمائی ہوئی ہے
وہی دلربا یار جانی کی سی ڈی

کہ تھا جس میں معصوم تو بھولا بھالا
وہی اک تری نوجوانی کی سی ڈی

ہے محفوظ اب تک مری میمری میں
لبادے اسی آسمانی کی سی ڈی

سراپا میں اخلاص ہوں اور عاصم
ترے ذہن میں بدگمانی کی سی ڈی

عاصم بخاری

ہر روز ہی مشرق سے نکلتا ہوا سورج
ہر گام پہ اک آہ سی بھرتا ہوا سورج

پیغام یہ دیتا ہے کہ سجدہ ہے ضروری
بے تاب جبیں خاک پہ رکھتا ہوا سورج

بے داغ ہو آدم تو ملائک سے ہے بہتر
شاعر سے مخاطب ہے چمکتا ہوا سورج

ہر سر سے گزرتا ہے مگن اپنے سفر میں
بے عیب دہکتا ہے دمکتا ہوا سورج

ٹھہرو گے تو ہر شخص ملامت ہی کرے گا
کہتا ہے ہمیں آج ابھرتا ہوا سورج

چادر یہ اٹھانی ہے شب تار کے رخ سے
امجد سے یہ کہتا ہے نکھرتا ہوا سورج

امجد ہزاروی

شناخت

فرخندہ شمیم

دونوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے اور ہمیشہ اس بات پر کڑھتے تھے کہ ایک ہی محلّہ ان کے مقدر میں کیوں ہے؟.. دونوں میں کچھ بھی تو مماثل نہیں ..... نوید ایک متمول خاندان کا انگلش میڈیم لڑکا اور فرید ایک متوسط طبقے کا اردو میڈیم نمائندہ..... بظاہر تو دونوں لڑکوں میں کوئی تقابل نہیں تھا لیکن متمول نوید متوسط فرید سے نجانے کیوں خائف رہتا تھا۔ حالانکہ ابھی تک صرف ایک واقعہ ایسا ہوا تھا کہ فرید انٹر سکولز ٹورنامنٹ کے ہاکی فائنل میں نوید کے مقابل جیت گیا تھا..... باقی جگہوں پر تو نوید ہی بازی باز تھا۔ لیکن نوید کو قلق دراصل اس بات کا ہوا تھا کہ ایک متوسط اردو میڈیم لڑکا اس کے بنگلے کے عقب میں ایک فوجی افسر کے سرونٹ کوارٹر کا رہائشی اس سے کسی بھی میدان میں جیت کیسے سکتا ہے؟

دونوں ہم مکتب نہیں تھے۔ البتہ ہم جماعت تھے دونوں ٹیوشن علاقے کے ایک ہی استاد سے ان کے گھر جا کر پڑھتے تھے... استاد کا نظریہ تھا کہ حصولِ علم محنت مانگتا ہے اور محنت کے اس راستے میں مرجانا شہادت ہے، چنانچہ وہ گھروں میں طلبہ کو پڑھانے کے لیے نہیں جاتے تھے بلکہ بچے خود ان کے گھر پڑھنے کے

لیے آتے تھے انہوں نے سب سے مخفی رہ کر فرید کی ٹیوشن فیس بھی آدھی کر دی تھی کہ ان کی نظر میں فرید کی لیاقت، محنت اور گھریلو حالات اس تعاون کے متقاضی تھے، انہیں فرید سے امیدیں بھی بہت وابستہ تھیں۔

موسم نے کروٹ بدلنا شروع کر دی تو بچوں کو گرم کپڑے پہننے کی تاکید سکول اور ٹیوشن سنٹر سے ہونے لگی۔

ٹیوشن کلاس میں نوید نے فرید کو ٹوکا۔

تم نے ساکس نہیں پہنی، کیا نہیں ہیں تمہارے پاس؟

کیوں نہیں۔ مگر میں انہیں ساکس نہیں موزے کہتا ہوں۔ تم نے محسوس کیا ہے کہ اس لفظ کے اندر کتنی گرمائش ہے۔ سردی سے کیسی بچت کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے؟

ہونہہ۔۔ اردو میڈیم، نوید بدبدایا

اور ہاں، انہیں جرابیں بھی کہتے ہیں، فرید نے مسکرا کر معلومات میں اضافہ کیا۔

یار مجھے تو ساکس کہنے میں کمفرٹ ہے۔ میری ماما نے مجھے یہی سکھایا ہے..... نوید تنک کر بولا

لیکن ماما کو اردو تو آتی ہوگی ناں۔

فرید نے سنبھال کر فقرہ چھوڑا۔

مجھے کیا پتہ، وہ انگلش میڈیم میں جو پڑھتی رہی تھیں۔

نوید کے لہجے میں تکبر ہی تکبر تھا۔

لیکن انگلش میڈیم میں تو بابائے قوم قائداعظم بھی پڑھتے تھے، اس کے باوجود آزاد ملک پاکستان کے لیے انہوں نے اردو کو قومی زبان قرار دیا، تاکہ اس ملک کی الگ پہچان بنے، زبان سے قوم اور ملک کی شناخت ہوتی ہے ناں نوید۔۔ فرید بولتا گیا

جب تک مسلمان غلام ملک میں رہے، انہیں ضرورتاً انگریزی سیکھنا پڑی لیکن اپنے ملک میں آ کر انہوں نے اردو کو وطن کی زبان بنایا

تو کیا دوسری زبانیں سیکھنا گناہ ہے؟

ہرگز نہیں، ہر علم حاصل کرنا فرض ہے لیکن دنیا میں اپنی ثقافت کا تعارف اپنی آزاد زمین کے ساتھ ساتھ علیحدہ طرز زندگی دین اور مخصوص زبان کے ذریعے کروانا چاہیے اگر ہم باہر کی دنیا میں انگریزی، ہندی، فرانسیسی یا چینی زبان بولیں گے تو دنیا ہمیں ان ملکوں کا غلام سمجھے گی اور طعنہ دے گی کہ ہمارے پاس تو اپنی قومی زبان تک نہیں ہے بولنے کے لیے..... ہم تو آزاد ہو کر بھی دوسروں کی زبان میں بات کرتے ہیں۔

نوید لاجواب سا ہو گیا

لیکن پیچ و تاب کھاتا رہا۔

ایک متوسط اردو میڈیم لڑکے سے ہارنا اسے گوارا نہیں تھا۔

بات آئی گئی ہو گئی

اگلی شام ہی کی بات ہے، فرید نماز کے لیے مسجد روانہ ہوا تو رستے میں نوید اسے کرکٹ کھیلتا ہوا ملا..... وہ بنیان اور نیکر پہنے ہوئے

تھا.....فرید کو دیکھ کر اس نے فقرہ کسا
ارے یہ حجاب میں کہاں جا رہے ہو؟
اس نے فرید کے مکمل لباس اور نماز کی ٹوپی پر چوٹ ماری تھی
کم از کم پورے کپڑے تو ہیں نا میرے پاس، تمہارے پاس تو آدھے بھی نہیں ہیں۔ فرید نے چمک کر لفظی وار کیا۔
نوید تلملا اٹھا
فرید نے ایک اور حملہ کر ڈالا
ویسے انگلش میڈیم میں تعلیم نماز سے تو نہیں روکتی۔ تم لوگوں نے تو سب کچھ ہی جھوٹے آقاؤں کا اپنا لیا ہے یار۔
فرید جذباتی ہونے کو تھا کہ اپنے والد کو آتا دیکھ کر چپ ہو گیا..... اس کے والد بھی مسجد جا رہے تھے۔ وہ ان کے ساتھ ہی ہو لیا
نوید کی کیفیت بدلنے لگی تھی
بے زار ہو کر وہ اپنے بنگلے میں لوٹ آیا۔
اسی میں امتحان کے دن قریب آ گئے۔ بورڈ کا سال تھا.. ٹیوشن ٹیچر پوری دل جمی اور انتہائی محنت کے ساتھ بچوں کی تعلیمی کمی پوری کروا رہے تھے..... بچے بھی دوسری تمام سرگرمیاں بھول کر صرف پڑھنے ہی میں جتے تھے۔
نوید خوب محنت کر رہا تھا اور فرید بھی
دونوں میں نمبروں کا مقابلہ بھی تھا، گو کہ دونوں الگ الگ میڈیم سے تھے۔
نوید فرید کے مقابل کم نمبروں کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا.....اور فرید کو کسی مقابلے کا جنون نہیں تھا
باتوں باتوں میں اس نے فرید سے طنزاً پوچھا تمہارے انگلش میں کتنے مارکس آتے رہے ہیں فرید
80 فیصد" فرید نے اعتماد سے بتایا
اچھا؟؟ 80 فیصد
نوید نے طنز بھرے تعجب سے آوازہ کسا
اردو میڈیم والوں کے انگلش میں اتنے نمبر؟
فرید بے کار گفتگو میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ امتحان سر پر تھے اور ایک ایک لمحہ قیمتی تھا، وہ کتابوں میں غرق رہا
بالآخر بورڈ کے پرچے ہو گئے اور نتیجہ بھی آ گیا
فرید بہترین تھا
نوید کے بھی ہر پرچے میں ٹاپ کلاس نمبر نکلے لیکن وہ اردو میں فیل ہو گیا تھا اور ایک مضمون میں فیل ہونے سے اس کا مجموعی نتیجہ نامکمل رہا تھا
.. وہ غصے میں چلانے لگا.....اردو میں کمپارٹمنٹ نے اسے بدحواس کر دیا تھا اب، وہ سب سے منہ چھپائے پھرنے لگا۔ ایک سادہ سے مضمون میں اس کی ناکامی ایک بہت بڑی سبکی تھی، وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا..... وہ بار بار متفکر ہوتا گیا اور ایک مرحلے پر یہ سوچ کر شرمسار ہو گیا کہ وہ ایک ایسی قوم ہے جو اپنی شناخت سے بھاگنے پر نامراد ہو جاتی ہے۔

☆☆☆☆☆

الوارثین

جب وہ پہاڑ سے اُترا بستی خاموش اور ویران سی تھی۔ وہ ایک خشک کنویں کی منڈیر پر بیٹھ کر کسی انسانی صورت کا انتظار کرنے لگا۔ سورج کے ڈھلتے ڈھلتے اس کے گرد لوگوں کی ایک بھیڑ جمع ہوگئی۔ بھیڑ کے لوگ اس کے بارے میں فیصلہ کرنے میں اُلجھ رہے تھے۔ سفید اور باریش بوڑھے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کسی کھوئے ہوئے عزیز کی تلاش میں بھٹک گیا ہے۔ اور اُسے رات ٹھہرنے کی جگہ دے کر اور کھانا کھلا کر صبح سویرے رُخصت کر دیا جائے۔ شکاری اور رہزن لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کسی طاقتور قبیلے کا جاسوس ہے اور ان کے بارے میں معلومات حاصل کر کے حملہ آوروں کی رہنمائی کرے گا۔ دُعائیں کرنے والے بزرگوں اور قربان گاہوں کے محافظوں کا خیال تھا کہ اُسے بزرگوں کے قبرستان میں کسی درخت کے ساتھ اُس وقت تک باندھ کے رکھا جائے جب تک یہ ظاہر نہ ہو جائے کہ وہ ان کے لیے بابرکت ہے یا منحوس۔

بھیڑ کے لوگوں کے ارادے بھانپ کر وہ اپنے تھکے پیروں پر کھڑا ہو کر کچھ دیر اُنہیں دیکھتا رہا۔ کچھ لوگوں نے ہاتھوں میں پتھر تھام لیے لیکن وہ صبر اور عاجزی کے ساتھ ان کے قریب جا کر بولا۔ میرے بارے میں کسی قسم کے خوف اور شک میں مبتلا نہ ہوں۔ میں تم میں سے نہیں ہوں۔ نہ میرا اس بستی میں ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔ تمہاری مقدس چیزیں، غیرتیں، دولتیں اور غذائیں اور دُعائیں میری زندگی کے کسی کام کی نہیں ہیں۔ میں مسافر ہوں۔ اور تمہاری بستی کے راستے میرے پیروں کے لیے نہیں ہیں۔ میں تمہارے خشک کنویں کے پاس پانی پینے آ بیٹھا تھا۔ میں پانی کا ڈول کنوئیں میں ڈال کر کھینچنے والا ہی تھا کہ تم لوگ جمع ہو کر میری زندگی کے جواز پر اُلجھنے لگے۔ تمہیں مجھ سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ

کلیم خارجی

تمہارا خدا میرا نہیں ہے۔ اور وہ کسی طور پر مجھے تم سے طاقتور اور خوش قسمت رکھنے پہ راضی نہیں ہوسکتا۔ میں بے ضرر ہوں اور بغیر کسی لالچ کے تمہیں احترام دیتا ہوں۔ چونکہ میں تم میں سے نہیں ہوں۔ اس لیے مجھے تم سے نفرت نہیں اور نہ ہی میں تمہاری کمزوریوں سے واقف ہوں۔ میں نے تم سے کچھ مانگا بھی نہیں ہے۔ مجھے تمہارے جیسی بھوک ہے نہ پیاس ہے کہ تم اپنے دسترخوانوں کو چھپانے اور محفوظ کرنے میں لگ جاؤ۔

دُعائیں مانگنے والے ایک صحت مند پیر آگے بڑھا۔ اور اُسے ڈانٹتے ہوئے بولا۔ تم ہمارے خدا اور ہماری زندگی کی توہین کر کے خود کو ہم سے بہتر ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہو۔ ہمارے بچوں اور ہماری عورتوں نے تم جیسا آدمی کبھی نہیں دیکھا۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ ہم تمہاری جان لیں۔ تم جس راستے سے آئے ہو۔ اُسی سے پلٹ جاؤ۔ وہ کچھ دیر خاموش حملے کی منتظر بھیڑ کو دیکھتا رہا۔ اور پھر واپس مڑ گیا۔ بستی کے لوگ اُسے جاتا ہوا دیکھتے رہے۔ کئی لوگوں نے اُسے زندہ چھوڑ دینے پر غصے کا اظہار کیا۔ لوگ آپس میں پھر اُلجھ پڑے ایک بوڑھا کنوئیں کے قریب گیا۔ اس نے جھانک کر نیچے دیکھا تو جذبات سے چیختے ہوئے بولا۔ کم بختو وہ ہمارے خشک کنویں کو پانی سے بھر گیا ہے۔ بھیڑ کے سارے کنوئیں کی طرف دوڑ پڑے۔ دیر تک لوگ پانی نکال نکال کر پیتے رہے۔ پھر یکا یک آواز اُبھری یہ کنواں ہمارا ملکیت ہے کیونکہ اسے برسوں پہلے ہمارے باپ دادا نے کھود کر اسکے گرد مضبوط دیوار اور منڈیر بنائی تھی۔ اس لیے ہم اس کے پانی کے وارث اور مالک ہیں کئی اور لوگ بھی کنوئیں کے مالک بننے کے نعرے لگانے لگے۔ ٹیڑھی لاٹھیاں ہاتھوں میں لیے کچھ لوگ الگ کھڑے ہوگئے ان میں سے ایک ادھیڑ عمر آدمی دہاڑتے ہوئے بولا۔ اس کنویں کے پانی پہ صرف اور صرف ہمارا حق ہے میرے دادا نے خواب میں بشارت پا کر اس جگہ کا انتخاب کیا تھا میرا باپ اکیلا کنواں کھودتے کھودتے جان سے گزر گیا تھا۔ تم لوگ اور تمہارے ہوتے سوتے تو سب بعد میں شامل ہوئے تھے۔ لہٰذا ہم کسی کو اسکے پانی کا اختیار نہیں دیں گے۔ پھر طعنوں، گالیوں اور لاٹھیوں کا ایسا شور اُٹھا کہ بستی لرز اُٹھی خون بہا لاشیں گری اور پھر کنواں لاشوں سے بھر گیا۔

☆☆☆☆☆

ایک آواز

رات کے اس پہر سیٹی کون بجا رہا ہے آواز گیٹ کے باہر والی سڑک سے آ رہی ہے۔ نہیں نہیں یہ قریب سے آ رہی ہے سیٹی کے --- ساتھ قدموں کی چاپ ہے۔ شاید بادل گرج رہے ہیں اس سمت سے ہلکی گرج کے ساتھ امڈتے بادلوں کی گونج ہے سردی بڑھ جائے گی کہیں بجلی نہ چلی جائے۔ ہوا تیز ہو رہی ہے درختوں کے پتوں میں سائیں سائیں سرسراتی ہے یہ ہماری چھت پہ کون چل رہا ہے کوئی بھگڈر سی ہو جیسے۔ الٰہی خیر۔ اوپر جانے کا راستہ تو بند ہے لگتا ہے آواز برابر والی ڈبل سٹوری سے آ رہی ہے اس بلا کی سردی میں یہ اوپر کیا کر رہے ہیں۔ بھاری چیز گھسیٹی جا رہی ہے۔ بارش میں۔ قتل؟ یہ لڑتے جھگڑتے بہت رہتے ہیں۔ کسی کے بولنے کی آواز؟۔ خاموشی ہو گئی ہے۔ کوئی نہ کوئی گڑ بڑ ضرور ہے ہوا کیا ہے دل ہولا جاتا ہے

چرروووں۔ یہ آواز تو پرانے جھولے کی ہے سرد رات کے اس پہر جھولا۔ ہوا کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو جھولا ہل تک نہیں سکتا۔ پھر یہ؟ آسیبی کہانیاں۔ قتل کی کہانیاں۔ ڈراؤنی کہانیاں زندہ ہو گئی ہیں۔ بادل نہیں یہ تو ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ ہے ---اتنی نیچی اڑان کا ہوائی جہاز--- جنگ تو نہیں چھڑ گئی--- رہا۔ جہاز کو آگ لگ گئی --زوں زوں کر کے گرنے والا ہے۔ اتنے زور کی آواز۔ لوگ موت کی نیند سوئے ہیں کوئی دیکھتا نہیں کوئی باہر نہیں نکلتا جہاز مکانوں پہ آ گرے گا

گررر گررر۔ آواز دور جا رہی ہے۔ دور جا رہا ہے جہاز۔

میآخ۔ واخ ------ ہائے مر گئی۔ وحشی کتے نے بلی کو کاٹ کے مار ڈالا ہے اتنی

دردانہ نوشین خان

زور کی چیخ جیسے آنتیں نکال دی ہوں بلا نے نیلی کوٹھی کا سیاہ کالا السیشن کتا کیسے بھونکے جا رہا ہے خوف سے رونگٹے کھڑے ہوئے جاتے ہیں کتے مشکوک سائے دیکھ کر غراتے ہیں -- ڈاکو اسلحہ بردار ڈاکو -- وہ چھت پہ گھسٹنے کی آواز ڈاکو ہوں گے -- لاونج کی کھڑکیوں پہ کھرچ کھرچ کیسی ہو رہی ہے کھڑکیوں کی جالی توڑی جا رہی ہے باہر والی ٹونٹی کس نے کھولی ہے شرر شرر پانی گر رہا ہے -- کیا تماشا ہے۔

گیٹ پہ زناٹے سے جیپ رکی ہے پولیس؟ ایف آئی اے؟ رات کو چاردیواری پھلانگ کر گرفتاری -- جس کی وجہ کا جواب کبھی نہیں ملتا -- کیوں -- مگر کیوں -- وہ بدرنگ خبریں جن کو ناشتے کی چائے کے ساتھ دیکھ کے ایک لاینک کے بعد بھلا دیا جاتا ہے وہ مجھ پہ چڑھ دوڑی آتی ہے -- میں کیوں؟ میرا نام کیوں؟ مجھے کیوں؟ کیوں کیوں چیوں چیوں -- سوڑ میں اتنے چوہے کہاں سے بھر گئے -- چوہے -- طاعون -- کرونا -- سانس میں چھرا لگنے لگے ہیں -- ناک پہ نقاب -- نقاب میں بند سانسیں -- جب گلہ دبایا جاتا ہے تو --- پھیپھڑے پھٹ جاتے ہیں -- جب بائیں کندھے میں درد کا دباؤ ہو تو دل کا حملہ --- دل کا حملہ جگر کا حملہ -- بیماری کی چڑیلیں --- اوہام کے بھوت --- تنہائی کا گلیشیر لڑھکتا چلا آ رہا ہے -- اس کے تلے نہ دبنا -- غرغرغوں -- دبنا ہوگا -- کیسی یہ جھپٹتی آوازیں -- خونخوار -- آدم خور آوازیں -- ہولناک آوازوں کا بپھرا ہجوم --- جیسے جنات کھلے پھرتے ہوں -- ہر آواز بدصورت ہے --- آواز ایک بدصورتی ہے -- نفرت سے لتھڑی ہوئی -- غیظ سے کھولتی ہوئی -- منافقت میں گھلی ہوئی -- بدلحاظ غضبناک تماش بین بے درد جیسے بھاری بوٹ تلے حشرات کی ناگوار مردہ آوازیں -- حشرات کی لجلجی کراہیں -- ناگواری کی بدبو -- خوف کی سرخ چھینٹوں کی آوازیں -- خوشامدی سونڈیوں کی لہریہ آواز --- طمانچے -- مغلظات کا ملغوبہ -- بے لفظ معنی دار آوازیں -- دندناتے پہیے -- چیختے ہارن -- شتر بے مہار -- شوربھری گونجیں --- تکبر کی سیاہ آواز --- معافی طلبی کی پہلی آواز -- جھوٹ کی نیلی آواز -- توہین کی زرد آواز --- فریب کی سرد آواز --- ادھ موا کر دینے والے خوف کا لمس رکھتی آواز -- اور --

ان میں سے ابھرتی اذان کی روپہلی آواز -- زرفشاں درخشاں نورزماں -- سکون بانٹتی -- سکھ دیتی رگوں اور ہڈیوں کے درمیان -- جس بلاوے میں اتنی توانائی ہے اس نورانی سفر کا عالم کیا ہوگا۔

اور اس سفر کی منزل کا جمال بعید از قیاس ----

☆☆☆☆☆

جیون کورکھ دھندہ ہے

ثمینہ سیّد

''ہم جیسے بیوقوف لوگوں کے لئے رشتے بھوک، پیاس اور سانس لینے جتنے ضروری ہیں - جدائی، سرد مہری یا نفرت بھی ملے تو ہماری محبت میں کوئی کمی نہیں آتی- ہاں رگوں میں زہر ضرور بھر جاتا ہے-''

''اور اگر یہ جدائی اولاد نے دی ہو اس اولاد نے جسے آپ نے کبھی ایک گھنٹے کے لیے بھی کہیں نہ چھوڑا ہو لیکن وہ آپ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنے میں ذرا سا بھی تامل نہیں کرتے بلکہ آپ کو اتنا غلط ٹھہراتے ہیں کہ آپ خود حیران رہ جائیں- تو ایسے میں چپ گہری چپ ہی سہارا بنتی ہے- صفائی کس کو دیں؟ جب کوئی ہماری بات سننا ہی نہیں چاہتا یار. تو کس کو بتائیں کہ وہ جو میرے سامنے کھڑا مجھے جھوٹا اور منافق کہہ رہا تھا، جو کہہ رہا تھا آپ کو چیزوں کی سمجھ ہی نہیں آتی ابا- اس کو اتنا عقلمند میں نے بنایا تھا- سوچنا سمجھنا، انگلی پکڑ کر چلنا، منہ میں نوالے ڈالنا رات بھر جاگ جاگ کر اس کی نیند کا خیال رکھنا . . . کروٹ بھی نہیں لیتا تھا میں کہ یشب کی آنکھ نہ کھل جائے- اس کی نیند نہ اڑ جائے اور اس کی ماں--- کمر کر کے نہیں سوتی تھی کہ کہیں یہ بھی منہ موڑنا نہ سیکھ لے، پھر بچے منہ موڑنا کیسے سیکھ لیتے ہیں؟ سکندر کا لہجہ نم ہو گیا-

''ہاں یار لوگ خاص نہیں ہوتے ہماری محبت

انہیں خاص بناتی ہے۔ بے فیض لوگوں کو ہمارا اہمیت دینا ہمارے اپنے لیے ہی تکلیف دہ روگ بن جاتا ہے۔ محبت کا سایہ ہٹتے ہی ان کی عامیانہ سوچ، زبان اور احساس کھل کر سامنے آجاتے ہیں اور ہمیں اپنی محبت پہ افسوس ہوتا ہے سراسر افسوس۔ یہ جو ہماری محبت کا سایہ ہے ناں یہ تب تک ہی رہتا ہے جب تک ہمارے بچوں کی زندگی میں کوئی دوسرا نہیں آتا.. ادھر کوئی ان کا حال بنا اور ہم...... ماضی بن گئے بس.."

"کتنی اذیت ہے ناں جیتے جی ماضی بن جانے میں۔ ہم کب چاہتے ہیں کہ ہمیں ایسے فراموش کیا جائے ہم جو زندگی کو اپنے خون سے رنگ عطا کرتے ہیں خود ہی بے رنگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یار بعض اوقات بہت محنت اور لگن سے کاتا ہوا ریشم اپنے ہی ہاتھوں الجھ جاتا ہے۔ پھر بیشک ہم پہلے سے زیادہ محنت کریں۔ سلجھانا تو دور کی بات سرا تک ہاتھ نہیں آتا۔ عمر بڑھتی ہے تو طاقت کم ہو جاتی ہے۔ نقصان سہنے کی ہمت بھی نہیں رہتی۔" سکندر نے اولڈ ہاؤس کی دیوار سے ٹیک لگائی اور سرد آہ بھری۔

"نقصان کی کیا بات کرتے ہو یار یوں سمجھو کہ کسی کی کھڑی فصلوں کو آگ لگ جائے یا فیکٹری میں دھماکہ ہو جائے اور راتوں رات دیوالیہ ہو جانے کا دکھ دوسرا کوئی صرف اسی وقت جان سکتا ہے جب وہ خود اس جیتے بڑے نقصان سے گزرے۔ نقصان کا ایک لمحہ پوری عمر کی کمائی پر غالب رہتا ہے۔ یہ لمحہ جو بنیادوں کی کمزوری سے یا کسی حاسد کی نظر سے رونما ہوا ہو۔ جس کی تلافی، واپسی یا ازالہ ناممکن ہے۔" جہانزیب نے کہتے ہوئے سامنے بیٹھی سکینہ کی طرف دیکھا جو لرزتے ہاتھوں میں لیے چاولوں میں سے پتھر نکال رہی تھی۔ نجانے کب سے یہاں تھی۔

"میں سوچتا ہوں تیری اور میری اور بات ہے سکندر. چل ہم تو مرد ہیں لہجہ کھردرا ہوگا یا پھر بہو کو گھر میں دوسرے مرد کا وجود کھٹکتا ہوگا اور بیٹے عموماً ماں سے جڑے ہوتے ہیں تو باپ کا غم محسوس نہیں کر پاتے ہونگے۔ لیکن یہ جو ماؤں کو گھر سے نکال دیتے ہیں رحمت کی چھاؤں سے نکل آتے ہیں یہ کیسے اور کیونکر کر پاتے ہونگے، کتنا حوصلہ چاہیے چھتنار درخت سے کٹ کر جینے میں. پنپنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ ماں بددعا نہیں دیتی لیکن اس کے آنسو بددعا بھی بن سکتے ہیں۔"

"یہ ہماری سوچ ہے پرانے لوگوں کی...... اکیسویں صدی کے لوگ ایسا بوسیدہ نہیں سوچتے بلکہ سوچتے ہی نہیں کر گزرتے ہیں" سکندر نے افسردگی سے ڈوبتے سورج پر نگاہ جمائی۔

"مرد تو ہمیشہ کا ڈھیٹ ہے خود کو ہار کر بھی مضبوط بنائے رکھتا ہے۔ لیکن یہ کومل سی عورت.. تھکن تو دیکھو اس کے چہرے پر"

"ملال بھی، شکست خوردہ ملال.. کہ ماں بنی ہی کیوں تھی؟ اپنی تخلیق کی صلاحیت پر شرمندہ ہے۔" جہانزیب نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں صاف کیں۔

دونوں اولڈ ہاؤس میں اترتی رات کی سوگواری

اپنے اندر اتارتے واکنگ ٹریک پر تیز تیز چلتے سکینہ کے پاس آ گئے۔ ہانپتے ہوئے اس کے پاس زمین پر بیٹھ گئے۔
"کھانے میں کیا ملے گا آج؟ جب تک ہے دم ہم کھائیں گے ۔ہم کھائیں گے بی جی" سکندر نے لہجے میں زبردستی بشاشت بھری تو سکینہ نے نرم سی مسکراہٹ چہرے پر سجائی۔
"دال چاول بنا دیئے تھے۔ گوبھی آلو کل کے لیے بنائے۔ یہ چھر چھنا تو یونہی وقت بتانا سمجھیں۔"
"ہاں وقت ہی تو بیت رہا ہے۔ ہم عام سے والدین ہیں یا بڑے عہدوں سے ریٹائرڈ لوگ۔ یہاں اولڈ ہاؤس میں یا اپنے گھر کے کسی عام، پرانے کمرے میں سب ایک وقت کے بعد صرف موت کا انتظار ہی تو کرتے ہیں اور کیا بچتا ہے.." سکندر نے آزردگی سے سکینہ کے زرد چہرے کو دیکھا تو اس نے آنکھیں صاف کیں۔"
"آپ لوگ اس خود ترسی سے نکل آئیں ہر ایک سانس کو مفید اور مستعمل بنانا سیکھیں ریٹائرڈ اور بوڑھے ہونا کوئی لعنت نہیں کہ خودکشی ہی کر ڈالیں یا کونے میں لگے لگے مر جائیں۔ ہم نے انتظامیہ کو بار بار درخواست پیش کی تھی کہ ہمارے لیے کام کا یا نوکریوں کا انتظام کرے۔ منظوری ہو گئی ہے لہٰذا اس سستی سے نکلیں۔ کپڑے شپڑے تیار کریں اور کل سے اپنے لیٹر وصول کر کے کام پہ لگ جائیں۔ مہربانی ہو گی۔
"جیون تو گورکھ دھندہ ہے۔ ٹامک ٹوئیاں نہ ماریں۔ نارمل زندگی گزاریں اور غم...... یہ جو پہاڑ جتنے غم ہمارے سینوں پر مسلط ہیں انہی کے ساتھ جینا سیکھ لیں۔ کوئی ہم سے محبت نہیں کرتا تو ہم خود تو اپنا وجود سنبھال سکتے ہیں۔ عطیات پہ گزارا اور موت کا انتظار ہی زندگی نہیں ہے۔ طعنوں کے تعویذ بنالیں روز ایک تعویذ پانی میں گھول کے پئیں اور نکل آئیں اس گورکھ دھندے سے۔"
سکینہ سرد، مرے ہوئے لہجے میں زندگی کا حکم دیتی ہوئی اندر کی طرف بڑھ گئی۔ سکندر نے اس کی چھلکتی آنکھوں کو دیکھ لیا تھا۔ لیکن ایک تیز روشنی کی کرن نے سکینہ کے وجود سے نکل کر سارا ماحول منور کر دیا تھا۔
"ہاں تو امید ہے ہر عمر میں، ہر روپ میں"
"لیکن سچ کہتی ہے یار جیون کے اس گورکھ دھندے میں صبر سے جئیں، زندوں میں شمار رہیں۔" سکندر جو اعلیٰ عہدے سے ریٹائر تھا یہاں شروع شروع میں عطیات دینے اور ان لاوارث لوگوں سے ملنے آتا تھا، لیکن اب اپنا دل بہلانے کے لیے، وقت بتانے کے لیے آتا۔ کبھی کبھی تو یہیں رک جاتا، گھر میں اس کی فکر ہی کسے تھی کہ پلٹنا ضروری ہو۔
"آج بی جی نے بڑی پتے کی بات کی ہے یار----- چل پھر سے کام کریں گے۔
"موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں۔" زندگی کی خوشگوار سی خنکی نے ان کے تھکے ہارے بوسیدہ وجود کو چھوا۔ وہ مسکراتے ہوئے اندر کی طرف بڑھے۔

☆☆☆☆☆

اِستہزا

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے سے مسلسل وہ ایک پتھر پر کھڑا تھا۔ پتھر کے چاروں طرف تند و تیز شور مچاتے پانی کا ریلا تھا۔ جب وہ کنارے سے اُتر کر پانی میں چلتا ہوا نہر کے درمیان گڑھے تقریباً چار فٹ اونچے پتھر پر پہنچا تھا تو اس وقت پتھر کے گرد پانی تقریباً ڈیڑھ فٹ اونچا تھا۔ لیکن پتھر تک پہنچتے پہنچتے پانی کی سطح یوں تیزی کے ساتھ بلند ہوئی جیسے زمین سے اُگ رہا ہو۔ اور اس کی کمر تک پہنچ گیا اور جب وہ پتھر پر چڑھ کر کھڑا ہوا تو دو فٹ کے اندر اندر پانی اس کے تخموں تک پہنچ گیا۔ جس وقت وہ کنارے سے پتھر کی طرف چلا تھا تو ہنس رہا تھا لیکن اب کچھ ہراساں تھا۔

اس نے نہر کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر جھاڑیوں کے درمیان بائیں طرف مڑتی پگڈنڈی سے اوپر چڑھ کر پُل کی طرف جانا تھا جس پر لوگ کھڑے تھے اور نیچے سے خوفناک، چنگھاڑتا جھاگ اُڑاتا پانی نکل رہا تھا جیسے شیمپین کُھل گئی ہو۔

سیر و تفریح کی غرض سے وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ اس شمالی علاقے میں تین دن کے لیے آیا تھا، جہاں دو دن سے لگاتار شدید بارش ہو رہی تھی۔ جس ہوٹل میں وہ قیام پذیر تھے وہاں سے پتہ چلا کہ ملک کے کئی شہروں میں سیلابی صورت حال ہے اور تو اور کراچی جیسے شہر میں بھی سیلاب کے باعث ذرائع آمد و رفت معطل ہو چکے ہیں۔

آج ان کا وہاں تیسرا اور آخری دن تھا اور سہ پہر سے پہلے پہلے انھیں نہر عبور کرنا تھی جو اُن کے راستے میں پڑتی تھی۔ لیکن ہوٹل کی آخری چائے پینے میں انھیں کچھ تاخیر ہو گئی تھی کیونکہ چائے کوئلوں پر بنتی تھی۔ گو کہ بارش اب کم ہو کر ہلکی پھوار رہ گئی تھی۔ پھر بھی کئی لوگوں نے احتیاطاً گھروں کی

اعجاز روشن

طرف واپسی کا قصد کر لیا تھا۔ ہوٹل کے باہر اونچے نیچے راستوں کی ہریالی پر بہت سے لوگ ٹولیوں کی صورت کندھوں پر سفری بیگ لٹکائے چل رہے تھے۔

گو کہ اس نہر پر پُل بنا ہوا تھا لیکن اس کے دوست نے کچھ من چلوں کی دیکھا دیکھی اور کچھ ایڈونچر کی خاطر نہر کو پُل کے بجائے اس کے پاٹ سے گزر کر عبور کرنے پر اصرار کیا۔ تب نہر میں پانی محض پنڈلیوں تک اونچا تھا۔ اس نے دوست کے اصرار کو قبول کرتے ہوئے کہا "ہاں اب اگر گھومنے آئے ہیں تو پورا فائدہ اُٹھانا چاہیے، کچھ یادگار لمحے لے کر گھر جانا چاہیے، کون سا روز روز یہاں آنا ہوتا ہے۔" نہر کو پہلے تین چار داڑھی والے طالبان قسم کے آدمیوں نے گھٹنوں تک شلواریں اُٹھا کر عبور کیا۔ پانی آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ تاہم اب ہلکی پھوار بھی رک چکی تھی۔ کچھ لوگ پُل پر کھڑے ہو کر سبز پوش پہاڑوں کے خوبصورت مناظر موبائل فونز میں قید کر رہے تھے۔

نہر کو پہلے اس کے دوست نے عبور کیا اور اسے احساس ہو گیا تھا کہ رفتار کے ساتھ ساتھ پانی کی سطح بھی بلند ہو رہی ہے اسی لیے دوسرے کنارے پر پہنچ کر اس نے آواز دے کر اور ہاتھ کے اشاروں سے اسے جلدی کرنے کا کہا تو وہ فوراً نہر میں اُتر گیا۔ پانی گھٹنوں سے اوپر آ گیا تھا۔ اس کی نظریں نہر کے عین بیچ ایستادہ اس چار فٹ اونچے ٹیلے نما پتھر پر گڑی تھیں، جس کے چاروں طرف ٹکراتے پانی کا زیر و بم ہر ہچکولے کے ساتھ پتھر کو لقمہ لقمہ نگلتا جا رہا تھا۔ اب اس کے پاؤں تہہ کی ریت سے بار بار اُٹھنے لگے تھے۔ اس سے پہلے کہ منہ زور پانی اسے بہا لے جاتا وہ پتھر پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔

پانی بڑھ کر اس کے ٹخنوں پر چڑھنے لگا تو وہ ہراساں ہونے لگا۔ اس نے کنارے پر کھڑے دوست کو مدد کے لیے پکارا تو پُل پر کھڑے لوگ بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نہر کے بیچ جس پتھر پر وہ کھڑا تھا اس کے دائیں بائیں دونوں طرف کناروں کا اس سے فاصلہ تقریباً پچیس پچیس فٹ تھا۔ جن تک تیر کر پہنچنا اس کے لیے دشوار یوں بھی تھا کہ تیرنا نہیں جانتا تھا۔

اس نے دیکھا کہ کنارے پر کھڑا دوست بے بسی کے ساتھ دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر منہ کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔ سامنے پُل پر کافی لوگ جمع ہو گئے تھے لیکن اسے وہاں موجود لوگوں کے چہروں کے آگے موبائل فونز دکھائی دے رہے تھے جن کے پیچھے

چہرے چھپ گئے تھے۔ جتنے چہرے اتنے فون۔ کسی کو اس کی مدد کا خیال نہ تھا یوں بھی مدد کا واحد ذریعہ رسی تھا، جس کے دُور دُور تک کوئی آثار نہ تھے۔ لہٰذا لوگ مطمئن ہو کر موبائل فون پر اس کی وڈیو بنانے لگے گویا انھوں نے یقین کر لیا تھا کہ ڈوب کر مرنا ہی اس کا مقدر ٹھہر گیا ہے اور پھر نظروں کے سامنے ڈوب کر مرتے آدمی کی وڈیو بہت یونیک بھی ہو گی لیکن اسی کا دوست آنسو بہاتے ہوئے اس کی وڈیو بنا رہا تھا۔ خوش قسمتی اور بدقسمتی سے بھی پانی اب اس کی پنڈلیوں سے نہ بلند ہو رہا تھا اور نہ کم۔ پتھر پر یوں کھڑے ہوئے اسے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ گزر چکا تھا۔ خنکی اور ٹھنڈے پانی میں مسلسل کھڑے رہنے سے اس کی ٹانگیں درد سے اکڑ کر بے جان ہونے لگی تھیں۔ شام کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ کوئی چاہتا تو اتنے عرصے میں قریب سے کہیں جا کر رسی لا سکتا تھا لیکن فون کو چھوڑ کر بھلا کون کسی کی خاطر اپنی دلچسپی اپنا وقت برباد کرتا ہے۔ پھر کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بھی جان بوجھ کر اپنا وقت برباد کرتا ہے۔ پھر کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بھی جان بوجھ کر ایسا سٹنٹ کر کے اپنے دوست سے وڈیو بنوا رہا ہے کیونکہ اس نے مدد کے لیے اب پکارنا بھی کم کر دیا تھا بس خنکی تھکن اور خوف کے باعث وقفے وقفے کے ساتھ بے یقین انداز میں ہاتھ اُٹھا کر لاغر سی آواز میں مدد کے لیے پکارتا اور کبھی تو محض ہاتھ اُٹھا کر رہ جاتا۔ لیکن پُل پر اسے لوگوں کے چہروں کی جگہ موبائل فون تنے دکھائی دیتے۔ پُل پر کھڑے لوگ بھی ایکسائٹمنٹ محسوس کر رہے تھے کہ اس کی کہانی بس اب ختم ہونے والی ہے اور سوشل میڈیا کے لیے ایک بہترین اور حقیقت پر مبنی، جیتی جاگتی موت کی وڈیو ان کے ہاتھ لگنے ہی والی ہے۔

وہ پتھر پر خاموش کھڑا خود کو اتنے سارے لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی بے بس محسوس کر رہا تھا۔ تبھی یکدم اس کی سوچ کا دھارا بدل گیا۔ اچانک اس کا سب خوف جاتا رہا۔ چہرے سے کرب کے آثار ختم ہو گئے۔ اس نے سوچا کہ ”بے بس کون ہے؟ یہ سب لوگ؟ یا وہ؟“۔ اس کے لبوں پر طنزیہ مسکان پھیل گئی۔ شاہانہ انداز سے سینہ تان کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور کولہوں پر ہاتھ جما کر پُل پر وڈیو بناتے لوگوں کو استہزائیہ نظر سے دیکھتے ہوئے ”میں بھی کن لوگوں سے مدد مانگ رہا ہوں، مجھے ان غلاموں کی مدد نہیں چاہیے۔“ اور پھر خود کو منہ زور لہروں کے سپرد کر دیا۔

☆☆☆☆☆

(A Moment) مائیکرو فکشن

وہ بیک وقت دو دنیاؤں کا مسافر تھا--- اسے متضاد جوانب کا سفر درپیش تھا---- ایک ہی وقت میں دو جانب سفر کیسے ممکن ہے؟؟؟ --- یہ سوچتے ہوئے وہ کہیں منزلیں طے کر رہا تھا--- اور کہیں سیڑھیاں اُتر رہا تھا- ایک طرف اندھا کر دینے والی تیز روشنی تھی تو دوسری طرف صبح تڑکے کے نور جیسا اجالا-- بار بار اس کے قدم لرز رہے تھے-- وہ خود کو جتنا اس نرم روشنی کی طرف کھنچتا پاتا اتنا ہی تیز روشنی کا ہالہ اس کے گرد تنگ ہونے لگتا- سنہری جھروکے اسے بلاتے ہوئے محسوس ہوتے تو لبوں پہ بوسے بیقرار ہونے لگتے- وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا مگر اوراق اس کی ساعتوں میں پھڑ پھڑانے لگتے اور یکبارگی اسے محسوس ہوتا کہ زمین زنجیر ہوگئی ہے- زندگی کے ماہ سال گویا تھے اور وہ چپ-- اوٹ کے اس پار سوال و جواب کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور اس پار نہ ختم ہونے والی مسافت --- کسی ایک کا تو انت ہونا چاہیے اس کے اندر کوئی بڑبڑایا--- اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا- وقت (Time The) سلامی کی خاطر جھکا ہوا تھا-- اور در و بام مسلسل قیام میں تھے--- وہ بھی جہاں کھڑا تھا لرزتا ہوا وہیں بے اختیار سجدہ ریز ہو گیا-

سید تحسین گیلانی

اوپر کی کہانی

واہ ری قسمت، تیرے بھی کیا کہنے! مَیں جو کہ دوسروں کی داستانیں لکھنے والا ہوں، ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میری اپنی ایک کہانی خود بخود بن گئی۔ یہ مجھ سے ''اُوپر کی کہانی'' تھی، درمیانی نہیں، نیچے والی بھی نہیں کہ جہاں میں کھڑا تھا۔ یہ اوپر، درمیان اور نیچے..... بھلا کیا بات ہوئی؟ آپ نے سوچا، پھر سوچا اور پریشان سے ہو گئے۔ مَیں نے بھی سوچا تھا اور پریشان ہو گیا تھا۔ بات بہت مزے کی نہ تھی لیکن حقیقی ضرور تھی۔

ہماری ایک چھوٹی سی فیملی ہے۔ میرے والدین، میں خود اور دو چھوٹی بہنیں۔ وقت نے جیسے جیسے موقع دیا، دونوں بہنیں اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ اب گھر میں صرف تین فرد رہ گئے۔ اکثر والدہ اصرار کرتیں: ''اب تُو سہرا باندھ لے، زیادہ دیر نہ لگا''۔ والد بھی اُن کی تائید کرتے۔

جب کوئی بہن بھولے بھٹکے انداز میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ گھر آتی تو مجھے یہی کہتی: ''بھائی، کب تک اکیلے اکیلے رہو گے، کہو تو بھابی لے آؤں؟'' دوسری آتی، اس کا بھی یہی انداز: ''بھائی تم بس ہاں کرو، ایک جوان خوبصورت بھابی تمہارے قدموں میں، نہیں نہیں، میرا مطلب ہے، تمہارے برابر لا کر بٹھائے دیتی ہوں!''

ایک روز میری والدہ کی ہم عمر ایک سہیلی جانے کہاں سے دو تین فوٹو اٹھا لائی اور مجھے کہا: ''لے ناصر، ان میں سے کوئی ایک پسند کر۔ پھر شادی والے دن تم میرا ڈانس دیکھنا۔'' میں ان سب باتوں کے جواب میں مسکرا دیتا اور کیا کرتا۔ بھائیں بھائیں کرتی جیب تھی اور دل بھی خالی، کوئی اس میں تصویر جاناں تھی ہی نہیں۔ کبھی پہلے ایک ہُوا کرتی تھی لیکن جب اچانک اسے کوئی امیر کبیر لڑکا بیاہ کر لے گیا تو میں نے اس خاص چہرے کی مسکراتی تصویر کو کھرچ ڈالا۔

اب حال کے زمانے کی بات کیا کروں۔ وہی ایک جیسے ٹھہرے ٹھہرے دن اور راتوں میں بستر بھی گرمائش سے خالی۔ سو، ایک خاص طرح کی بے نیازی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب وہی میری گائیڈ تھی۔

ایک دن میں آفس سے گھر آیا تو جانے کیسے امّی کو بیٹھے بیٹھے تاؤ سا آ گیا۔

''بات سُن رے لڑکے، پنڈی کے اسی رام

محمد طارق علی

پورے محلے میں ہمارے دور کے عزیز رہتے ہیں۔ ان کی مسز نے کئی بار مجھے اچھا رشتہ بتانے کا کہا ہے۔ تو پرسوں یعنی اتوار والے دن میرے ساتھ ان کے ہاں چل۔''

پیدل کا راستہ تھا۔ مقررہ وقت پر ہم دونوں ان صاحب کے گھر کی جانب چل پڑے۔ یہ میرا پہلا موقع تھا کہ میں رشتے کے لیے خود کو دکھانے اور منظور کرانے کسی گھرانے کی طرف جا رہا تھا۔ ایک عجیب سی کیفیت لیے ہوئے، ایک طرف میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا اور دوسری طرف میں گویا ہاتھوں میں خوشی کے دیپک بھی اٹھائے ہوئے تھا۔

مطلوبہ گھر کے دروازے پر پہنچے تو صاحب خانہ اور ان کی بیگم نے ہمارا استقبال کیا۔ مجھے دیکھ کر محترمہ بولیں: ''ارے ناصر تم، کافی بڑے ہو گئے ہو۔ تمہاری آنٹی رحمانہ کی شادی میں تمہیں چھوٹا سا دیکھا تھا۔'' میں جواباً مسکرایا۔ ہم اندر جا بیٹھے۔ چائے آ گئی۔ اور اسی دوران صاحب خانہ نے میرا خاصا طویل انٹرویو لیا۔ بات میرے روزگار کی آئی تو انہوں نے پوچھا: ''اچھا تو آپ نے کون سے اخبار میں کام کا بتایا تھا؟'' جواب دیا ''روزنامہ امنگ''۔

''ارے، یہ تو اچھا خاصا مشہور و مقبول اخبار ہے، کتنی تنخواہ ہے؟''

''بیس ہزار روپے ماہانہ، اس کے علاوہ کچھ اوور ٹائم بھی۔''

''بس؟ اور اوپر سے کتنے بن جاتے ہیں؟''

''انکل، حلال کی کھاتا ہوں، والد کی بھی مجھے یہی ہدایت ہے۔''

انہوں نے بُرا سا منہ بنایا اور میز سے اُٹھ کر صوفے پر جا بیٹھے۔ ان کے ساتھ ہم بھی۔ میں نے غور سے دیکھا، ڈرائنگ روم کے دروازے کا پردہ مسلسل ہل رہا تھا۔ جانے اس کے پیچھے کون تھا یا تھی۔ شاید وہ ہستی لک چھپ کر میری شکل کی جھلک دیکھنا چاہتی ہوگی حالانکہ میری فیس ویلیو بھلا کیا تھی۔

''بات یہ ہے ناصر صاحب!'' محترم نے پھر سے بات کا سرا جوڑا۔ ''میں نے ریلوے میں تیس/ پینتیس سال بطور گارڈ سروس کی ہے، برٹش دور سے آغاز لیا تھا۔ آپ کی طرح تن خواہ کم تھی لیکن اوپر سے کافی پیسے بن جاتے تھے۔ یہاں تک روزانہ سبزیاں، پھل، فروٹ بھی مل جاتے تھے اور بغیر کہے، بن مانگے۔ سو، بات شخصیت کی بھی ہوتی ہے۔'' ہم ماں بیٹا خاموش بیٹھے ان کا کہا سنا کیے۔

''آپ کو ہم سوچ کر جواب دیں گے'' ان کی اسی بات کے ساتھ ملاقات ختم، موصوف کا جواب کبھی نہ ملا۔

اسلام آباد میں رحمانہ خالہ کے ہاں سے

بلاوے پر بلاوا آ رہا تھا۔ امی جان بوجھ کر ان کے ہاں نہیں جا رہی تھیں کیونکہ وہ میری چھوٹی بہنوں کی شادیوں میں شریک نہیں ہوئی تھیں، چکیلے سے بہانے بنا دیے تھے لیکن اصل وجہ تھی ان کے گھرانے کا اونچا پن۔ لیکن ایک روز بالآخر ہم چلے گئے۔ اس مرتبہ والد صاحب بھی ساتھ تھے۔ ٹیکسی اپنی تھی۔ خالہ اور خالو نے گرم جوشی سے استقبال کیا۔ شاہانہ قسم کے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھایا۔ ہیوی ٹی پیش کی گئی۔ خالہ نے چند منٹ کچھ ماضی اور حال کی باتیں کیں۔ پھر خالو نے اصل بات شروع کی۔ خدا جانے یہ کوئی انٹرویو تھا یا کسی مجرم سے پوچھ گچھ۔ سوال وجواب ہوتے رہے۔

"تو پھر آج کل کون سے اخبار میں ہیں آپ، اور کس پوسٹ پر؟" میں نے جواب دے دیا۔

"اتنے اچھے اخبار میں آپ کی تنخواہ تو معقول ہوگی؟"

"بس اللہ کا شکر ہے"۔

"پھر بھی کوئی فگر تو بتایئے"۔ تنخواہ کا فگر بتایا تو ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ آنکھوں کے زاویے بنے اور آنکھوں میں ہی کہیں گم ہو گئے۔ اس کے بعد وہی "اوپر سے کیا کچھ؟" والا سوال۔

"اوپر سے کچھ نہیں، وہی حق حلال کی روزی"۔ خالو بیٹھے بیٹھے کچھ سمٹ گئے۔ بولتی بھی بند ہو گئی۔ فوراً خالہ اور خالو نے الگ جا کر مشورہ کیا، پھر واپس صوفے پر آ بیٹھے۔

"سوری بہن، جتنی تنخواہ بتائی ہے اس میں تو ہماری بیٹی تنگ دست ہی رہے گی جبکہ مکان بھی آپ کا اپنا نہیں ہے۔"

ہم تینوں واپسی کے لیے اٹھے۔ خالہ اور خالو ہمیں الوداع کہنے گیٹ تک آئے۔ "یہ ٹیکسی آپ کی ہے؟"

"جی ہاں"۔ دونوں کا منہ پھر بن گیا۔ آنکھوں سے حقارت ٹپکنے لگی لیکن بولے کچھ نہیں کیونکہ منفی جواب تو وہ پہلے ہی دے چکے تھے۔

ان دونا کامیوں اور "اوپر" کا بوجھ سر پر لیے میں چند دن خاموش خاموش رہا لیکن جلد ہی روٹین نے مجھے اپنی جانب پوری طرح کھینچ لیا۔ امی کو بھی چپ سی لگی ہوئی تھی۔ ایک روز بول پڑیں۔

"بیٹا، چھوڑو یہ اخبار کے بیس ہزار ماہانہ، اور کوئی اچھا کام کرو۔"

"جی بہتر ہے امی جان۔"

چند ماہ بعد لاہور سے بیک وقت دو شادیوں کے دعوتی کارڈ ملے۔ دونوں تقریبات کی تاریخیں آگے پیچھے تھیں۔ والدہ خوش ہو گئیں کہ چلو وہاں ہمارے بہت سے عزیز ہوں گے۔ ناصر کے لیے کوئی نہ کوئی لڑکی مل

ہی جائے گی۔ پہلی شادی کرشن نگر میں تھی۔ سبھی مہمانوں کے ساتھ ہماری بھی خوب آؤ بھگت کی گئی۔ جلد ہی اکثر مہمانوں کو پتہ چل گیا کہ پنڈی والا ناصر ابھی تک کنوارا ہے تو شادی کی تقریب کے بعد مجھے چند رشتہ داروں نے گھیر لیا۔

"کب کروگے شادی، عمر تو بیتی ہے" اس کے بعد وہی روایتی سوالات: ملازمت کیا ہے، دفتر کونسا ہے اور پھر "اصل" سوال تن خواہ والا۔ تن خواہ کا ہندسہ سن کر سبھی کے منہ لٹک گئے۔

"ناصر میاں، تن خواہ تو جو ہے سو ہے 'اوپر' سے کیا بن جاتا ہے؟"

"اوپر سے کچھ بھی نہیں، بس رزق حلال"۔

"یہ تو کچھ نہ ہوا"۔ سبھی رشتہ دار اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔

دو دن کے بعد ہم دھرم پورہ میں تھے۔ یہاں بھی تقریباً وہی رشتہ دار مدعو تھے۔ فنکشن کے بعد میں ایک بار پھر "پکڑا" گیا۔ "ہاں بتاؤ، آپ نے شادی اب تک کیوں نہیں کی؟" وجوہات کئی تھیں، سب بتا دیں۔

"نوکری تو آپ اچھے اخبار میں کرتے ہیں، تن خواہ بھی اچھی ہوگی؟"

ہاتھ میں آنے والی تن خواہ بتا دی۔ "اوپر" سے کتنے بن جاتے ہیں؟

اوپر، اوپر، اوپر اسلام آباد سے راولپنڈی اور اب لاہور تک بھی ایک سوال۔ اس نے مجھے پاگل کر دیا۔ میں تو اچھا بھلا زمین پر ہوں، پھر "اوپر" کا کیا سوال؟ ہم اسی سوال کا بوجھ لیے پنڈی لوٹ گئے۔

چار دن بعد اتوار تھا۔ اسی روز امّی کی ایک پرانی واقف کار بیوہ خاتون ہمارے گھر آئی۔ ساتھ میں ایک دھان پان سی سانولے سلونے چہرے والی لڑکی بھی تھی۔ کچھ دیر خاتون اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ پھر کہا۔ "باجی، مجھے جلد گھر جانا ہے"۔ اس کے ساتھ ہی وہ اٹھی اور لڑکی کا ہاتھ امی کے ہاتھ میں دے دیا۔

"اوپر اللہ ہے اور نیچے آپ" امی نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"میں بیوہ ہوں۔ لینے دینے کی بات کر ہی نہیں سکتی۔" وہ گیلی آنکھیں دوپٹے کے پلّو سے پونچھنے لگی۔

امی اب تک خاموش تھیں۔ میں نے دیکھا ان کی آنکھوں سے رحم چھلک رہا تھا۔ آخر بولیں: "جو کچھ کرے گا لڑکا ہی کرے گا اور ظاہر ہے اپنی سوچ کے مطابق۔"

"میں نے اپنی درخواست دے دی ہے، اب جو آپ کا فیصلہ ہو"۔ اس کی آنکھیں پھر گیلی ہو گئیں۔

مہمان خاتون کے واپس جانے سے قبل ماں کا بیٹا سر خم کر چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

حدیں ٹوٹیں تو......

کفِ پا اور زمیں کے درمیاں
جوتوں کے تلووں کی جو اک دیوار حائل ہے
کسے معلوم کن بے نام لمسوں،
نُو بہ نُو کیفیتوں،
نایاب و خوش امکان سُوجھوں سے
ہمیں محروم رکھتی ہے
درِ وجدان تک جانے نہیں دیتی
نہاں جو بھید ہیں مٹی میں
وہ پانے نہیں دیتی
گھروں اندر درختوں، آبشاروں،
تتلیوں، پھولوں کی
تصویریں سجا لینے سے
کب پریاں اترتی ہیں
'ہوا ضبط' آشیانوں،
دفتروں، کاروں کی قیدی زندگی
کیا بادلوں کے ساتھ پروازے
ہوئے محتاج ایسے کیلکولیٹر کے
کہ بس دس بیس کی گنتی کی خاطر بھی
انگوٹھے ساتھ کی پوروں کو مس کرنا
بھلا بیٹھے
سہولت کے جنوں میں
خود سے کتنا دور جا بیٹھے
نہ دل جب
کیمیائی حرب ہتھیاروں سے بھر پایا
تو فرعونی تمنا نے
ہوسِ یک آدمی ایجاد نے کا خبط اپنایا
یہ پاگل پن
درندوں ساتھ انسانی کلوننگ تک چلا آیا
کہاں ڈھونڈے کوئی
مہر و محبت اور امن و خیر کا سایا
خطا کاری سرشتِ آدمیت ہے
مگر وحشی اس قدر بھی کیا
کہ ہم جنسی کی لت
آدرش اور آئین ہو جائے
روش انساں کو نا انساں بنا دینے کی بھی
اک دین ہو جائے
حدیں ٹوٹیں تو
انہونی کے کیا کیا زلزلے پھوٹیں
یہ بولائی ہوئی برفوں کی یلغاریں
یہ بپھرے تند طوفانوں کی ماریں
سو جگہوں سے پھٹی اوزون کی چادر
کہیں پر راج سُوکھے کا
کہیں ہر شے بہا لے جا رہے سیلاب کی شوکر
گلوبل گاؤں پر نت یورشیں کرتے
اجل لپیٹے یہ وائرس گھر گھر
کبھی سوچا
کہ بیرون و دروں قائم توازن توڑنے میں
خود ہمارا کتنا حصہ ہے
یہ کیسے ہَول حشر آتے
زمانوں کا سفر آغاز ہے ہم سے
ہمیں جانے خبر کب ہو
کہ فطرت کس قدر ناراض ہے ہم سے

جلیل عالی

اکیلے رہ کے جینا ہے

مجھے تم سے محبت ہے
مگر ایسی محبت
جس میں اب وہ گرم جوشی، بے قراری
اور تڑپ دل میں نہیں پھر بھی
مجھے تم سے محبت ہے
کہ میں نے تم کو چاہا تھا
تمہیں گھر لے کے آیا تھا
محبت رنگ لائی تھی
ہمارے پھول سے بچے
ہمارے گھر کی رونق ہیں
مگر وہ گرم جوشی، بے قراری
اور تڑپ دل میں نہیں پھر بھی
مجھے تم سے محبت ہے!!
یہ سچائی زباں پر آ گئی آخر
کہ اب ہم مطمئن ہیں
اور اگر ایسا بھی ہو اک دن
جدا ہونے کا وقت آئے
تو دو آنسو بہا کر ہم
نصابِ زندگی بدلیں
ورق پر جو بھی لکھا ہو
اسے پڑھ کر نصیبِ دشمناں
بے نور آنکھوں سے
اسے مٹتے ہوئے دیکھیں
کہ انجامِ محبت یوں بھی ہونا ہے
کسی اک نے خوشی سے
دوسرے کا غم بھی سہنا ہے
اکیلے رہ کے جینا ہے
یہ زہرِ غم بھی پینا ہے

حسن عسکری کاظمی

نوحہ [اپنے مرحومین کے حوالے سے]

جا کے ڈھونڈیں کہاں کچھ بتایا نہیں
نا گہاں چل دیئے ہو کدھر یا اخی
سوجھتا ہے یہی تم کو شام و سحر
ہم پکارا کریں در بدر یا اخی
کیسے بھولے تمھاری جوانی ہمیں
مارتی ہے یہی رایگانی ہمیں
ایک پل نے ہمیشہ کا دکھ دے دیا
تم کو روئیں گے ہم عمر بھر یا اخی
ذہن مشکل مسافت سے آگاہ تھے
سہل تھیں منزلیں تم جو ہمراہ تھے
اور اب جب کہ تم قافلے میں نہیں
جانے کیسے کٹے گا سفر یا اخی
پہلے سر سے تحفظ کا سایا گیا
ہاتھ سے ایک اک ماں کا جایا گیا
جنگ میں ہوں مگر لے گئی چھین کر
مجھ سے تقدیر تیغ و سپر یا اخی
پیر ہو نوجواں ہو کہ معصوم ہو
چاہے کیسے گھرانے کا مقسوم ہو
موت کا بھیڑیا رحم کھاتا نہیں
اس کے جبڑے لہو میں ہیں تر یا اخی
تیز آندھی قیامت بپا کر گئی
ناؤ سے بادباں کو جدا کر گئی
پانیوں کے مسافر پریشان ہیں
پڑ رہے ہیں بھنور پر بھنور یا اخی
یاد آیا نہ اصرار احباب کا
پاس رکھا نہ محفل کے آداب کا
بزمِ ہستی میں تم میرے بعد آئے تھے
اٹھ گئے مجھ سے کیوں پیشتر یا اخی
تم بہادر بھی تھے حوصلہ مند بھی
قاعدے اور کلیے کے پابند بھی
پھر یکا یک یہ من میں سمائی ہے کیا
چل دیئے سب حدیں توڑ کر یا اخی

گلزار بخاری

زمیں تُو ماں ہے کیسی [ترکی اور شام کے زلزلے کے حوالے سے]

کسی چڑیا کے بھی نوخیز بچے
جب نگلنے سانپ بڑھتا ہے
اٹھائے آسماں سر پر
کوئی مرغی بھی خطرے کی بھنک پاتے ہی
چوزوں کو پروں میں کھینچ لیتی ہے
کسی بچھڑے کو بھی تکلیف دے کوئی
اسے گائے پٹخ دیتی ہے سینگوں سے
خطر میں گربہ مسکین بن جاتی ہے شیر ایسی
مقابل ہو اگرچہ گرگ ظالم بھی
بری نیت سے وہ دیکھے جو اس کی کوکھ
سے نکلے ہوئے
معصوم کی جانب
وہ پنجے سے نکالے اس کی آنکھیں بھی
کس ذی روح کو دیکھا نہیں اولاد پر وہ
آنچ آنے دے
مگر بھونچال میں کچھ اور ہی منظر نظر آئے
وہی دھرتی جسے کنجِ اماں گردان کر سب
گھر بناتے ہیں
سمجھتے ہیں کہ مشکل میں پریشاں خاک
زادوں کو
وہ سینے سے لگائے گی
نگل لیتی ہے چپکے سے مکینوں کو
خیال آئے اسے جھنجوڑ کر پوچھیں
کوئی ماتا بھی ہو پوتوں پہ جاں تک وار دیتی ہے
زمیں! تو ماں ہے کیسی' اپنے بچے مار دیتی ہے

گلزار بخاری

برسات کا اک دن

وہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی
حقیقت ، خواب میں لپٹی ہوئی تھی

وہ جب آئی ، تو کُھل کر ابر برسا
گھٹا پہلے سے گو ، چھائی ہوئی ہے

مجھے بھی اک صدا اندر سے آئی
خبر اُس کو بھی دل نے دی ہوئی تھی

کہ آج اک دوسرے سے ہم ملیں گے
ملاقات آج کی لکھی ہوئی تھی

نہ اُس کو دیکھ کر حیران تھا میں
نہ مجھ سے مل کے وہ چونکی ہوئی تھی

سلونی سانولی رنگت اور اس پر
قبا نارنج سی پہنی ہوئی تھی

وہ کجلائی ہوئی آنکھوں کی جھلمل
شفق رخسار پر پھیلی ہوئی تھی

وہ ادھ کالی، چمکتی اُس کی زلفیں
سراپا شام تھی ، مہکی ہوئی تھی

تبسم وہ ، جو قابو میں نہ آئے
تکلم وہ کہ ضو پھوٹی ہوئی تھی

سمٹتی ہی گئی اُس کے لبوں میں
وہ خاموشی ، کہ جو پھیلی ہوئی تھی

تعاقب میں تھیں لوگوں کی نگاہیں
مگر دنیا کو وہ بھولی ہوئی تھی

کوئی منزل پہ جیسے آگیا ہو
وہ مجھ سے مل کے یوں چہکی ہوئی تھی

ذرا سا مَس کیا ، تو چونک اُٹھا میں
وہ سر سے پاؤں تک دہکی ہوئی تھی

سمٹ کر رہ گئی دیکھا ، جو میں نے
ردا شانوں سے کچھ ڈھلکی ہوئی تھی

اُسے کچھ یاد آیا ، اُٹھ پڑی وہ
ابھی کچھ گفتگو جاری ہوئی تھی

بہت کچھ چاہتا تھا اُس سے کہنا
زباں ، دل میں مگر اٹکی ہوئی تھی

بہت ہی پُرسکون اور مطمئن سی
دمِ رخصت وہ کیا نکھری ہوئی تھی!

فقط اک وہم تھا ، یا واقعتاً
''وہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی؟''

جمشید چشتی

بسم اللہ.....

اِبتدا ، انتہا ہے بسم اللہ
نُور کا سِلسلہ ہے بسم اللہ

رنج و غم کی دَوا ہے بسم اللہ
میری حاجت رَوا ہے ، بسم اللہ

ساری آیات ہی مقدس ہیں
ان میں سب سے سِوا ہے بسم اللہ

عشق آغاز ہو گیا آقاؐ
میرے لب پر کِھلا ہے بسم اللہ

ہاتھ میں ہے درود کی تسبیح
اس پہ دِل سے پڑھا ہے بسم اللہ

رُوح میں پُھول کِھل اُٹھے جیسے
جب بھی دِل نے کہا ہے بسم اللہ

آئیں دَر پر مرے سبھی پیارے
میں نے دِل وَا کیا ہے بسم اللہ

کیوں نہ خُوشیوں کے گھر میں ڈیرے ہوں
میرے دَر پر لکھا ہے بسم اللہ

وصل کا وقت آن پہنچا ہے
ہجر حل ہو گیا ہے بسم اللہ

یاد کُچھ بھی نہیں ہے اس کے سِوا
میرا آموختہ ہے بسم اللہ

آئی رستے میں جب کوئی مشکل
ہم نے ہنس کر کہا ہے بسم اللہ

چُومتا ہوں میں اپنے ہاتھوں کو
اِن پہ تابش لکھا ہے بسم اللہ

تابش کمال

ہائے! افسوس!!

میں اِس شہر میں اجنبی ہوں
مرے ہاتھ پر
یہ جو الجھی ہوئی ایک تحریر ہے
اِس کا میری جبیں کے نوشتے سے کوئی
علاقہ نہیں
اعتبارِ شواہد کے اِس آئنے میں
عدالت کا صرفِ نظر غیر ممکن سہی
چند سانسوں کی مہلت ہی دے دیجیے
سر سے بارِ امانت اترتے ہی
اک سانس اوپر
نہ اک سانس نیچے
میں لوٹ آؤں گا
قاضیِ شہر کی برگزیدہ خموشی کے عکسِ جلی میں
لرزتی ترازو کی ہیبت سوا ہوگئی
''کوئی ضامن؟ کہ جو اپنی گردن کو گروی
رکھے؟''
ایک امید سانسوں میں پیوند ہونے لگی
''کوئی ضامن کہ جو.....؟''

میری درخواست ہر زہ پھری
اور بے دستخط میرے پاس آگئی
اس بھرے شہر میں
سارے کردار موجود ہیں
بس نہیں ہے تو کوئی ابوذرؓ نہیں
کیسی روشن کشادہ جبینیں ہیں لیکن کسی پر
کسی دوسرے کے دکھوں کا پسینہ نہیں
یہ مدینہ نہیں

احمد حسین مجاہد

نظم

ابھی تو آ کے بیٹھے ہو
ابھی سے جا رہے ہو تم
ابھی تو ہجر کے لمحوں کے سارے زخم تازہ ہیں
ابھی تو بیقراری دل کی تھمنے بھی نہیں پائی
ادھوری خواہشوں نے آنکھ کھولی ہے
ابھی تو بے یقیں آنکھوں میں تیرا عکس لرزاں ہے
ابھی تو چاک دامن کے رفو ہونے نہیں پائے
ابھی تو کہنے سننے کے مراحل بھی نہیں آئے
ابھی تو آیتیں عہدِ وفا کی
دل صحیفے پر رقم ہونے نہیں پائیں
ابھی تو رہگزر پر
میرے اشکوں کی نمی کی باس باقی ہے
ابھی تو رات باقی ہے
ابھی تو بات باقی ہے
ابھی سے جا رہے ہو تم
ابھی تو آ کے بیٹھے تھے

افتخار شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دِرِ امکان کُھلنے کو ہے خالد
کہاں تک حادثے ٹلتے رہیں گے

نظم

مارچ کا مہینہ جب
میرے شہر آتا ہے
چاہتیں بڑھانے کو
نفرتیں مٹانے کو
سنگ ساتھ لاتا ہے

سنگ اک روایت ہے
سنگ اک حکایت ہے
ساتھ ساتھ رہنے کی
ساتھ ساتھ چلنے کی
اک حسیں روایت ہے
سبز پرچموں کے ساتھ
سرخ چادروں والے
گیت گاتے آتے ہیں
دوستی کے سچے گیت
سب کو وہ سناتے ہیں
دل سے دل ملاتے ہیں
سنگ کو سجاتے ہیں
تب ہماری بستی میں
پھول مسکراتے ہیں
رونقیں بڑھاتے ہیں
شہ کبیڑ کی بستی
مسکرانے لگتی ہے
جگمگانے لگتی ہے
پیار اور محبت کے
گیت گانے لگتی ہے
میلہ سنگ کا موسم
قہقہوں کا موسم ہے
دوستی کا موسم ہے
سنگ ہی میں بنتے ہیں
سنگ زندگی بھر کے
سال بھر مرے سنگی
انتظار کرتے ہیں
میلہ سنگ سجنے کا
چاہتیں لٹانے کا
پیار کو بڑھانے کا
سنگ اک بنانے کا
میں بھی منتظر کب سے
اپنے پیارے سنگی کا
پر وہ اب نہیں آتا
سب کا سنگ آتا ہے
میرا سنگ **نئیں** آتا

سید فرخ رضا ترمذی

اندیشہ

افتخار شوکت

یونہی شام و سحر ہونگے
ازل سے جس طرح سے ہوتے آئے ہیں
یونہی سارے سفر ہونگے
یہ سورج چاند تارے آسماں
سب ہی ادھر ہوں گے
زمیں ہوگی
زمیں پر دشت و دریا
بحر و بر ہوں گے
یونہی آباد شہروں کے
نگر ہوں گے
یونہی سڑکوں پہ اجلی
رونقیں ہوں گی
یونہی یہ خواب سی گلیاں
دریچے اور گھر ہوں گے
مگر جو آنے والا وقت ہے اس میں
نجانے ہم کدھر ہونگے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دیکھنا یہ ہے کہ ہم کیوں سرِ کہسار آئے
قد بڑھانے اگر آئے ہیں تو بے کار آئے

نثری نظم

تم سے بچھڑ کر میں نے چاہا

تمہاری یادوں کے رنگ چھڑانا

سو اک دن الماری کی تہہ سے میں نکال لائی

تمہارے نامے (جنکے لفظ بھی ماند پڑ چکے تھے)

کچھ تصویریں (وقت کی گرد سے دھندلائی ہوئی سی)

چند خشک پھول (جنکی خوشبو گئے دنوں نے اڑا سی دی تھی)

جلا کر انکو اب انکی راکھ کے پاس بیٹھی یہ سوچتی ہوں

دل پہ ثبت تیری چاہتوں کے نقوش کیونکر مٹاؤں کہ

تمہاری کج ادائی کے باوصف بھی

ان پر ہجر و فراق کے موسموں کی تمام تپشیں بے اثر ہیں

نائیلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جذبوں کے بادل لائیں گی یا رُوح بخ کر جائیں گی
کیا جانئے کس سمت سے کیسی ہوائیں آئیں گی

ماں

یہ نہ سمجھو کہ نہیں دل میں عقیدت ماں کی
روز ہوتی نہیں آنکھوں کو زیارت ماں کی

میں جو عزت سے زمانے میں جیے جاتا ہوں
میرے جیون پہ ہے یہ ساری عنایت ماں کی

دل کی دھڑکن اسے کہتا ہے زمانہ لیکن
میرے سینے میں دھڑکتی ہے محبت ماں کی

وہ کسی طور بھی جنت میں نہیں جا سکتا
جس کو معلوم نہیں عزت و حُرمت ماں کی

چہرۂ خالق ہستی میں ہے ممتا کا اثر
رب کی صورت ہمیں دکھلائے گی صورت ماں کی

اذن جنت کا سرِ حشر عطا جب ہو گا
ہو گی درکار مجھے پھر بھی اجازت ماں کی

میرے نزدیک وہ قسمت کے دھنی ہیں قلبی
باندھ لیتے ہیں جو پلّے سے نصیحت ماں کی

قلب عباس قلبی

پرائیڈ آف پرفارمنس فرحت عباس کی محبت میں

[23 مارچ 2023 کے موقعہ پر]

بتلا ہو گیا

بتلا ہو گیا

میں ترے عشق میں بتلا ہو گیا

سارے انکار اقرار مشکل سوالات کا ایک

بھاری پلندا

سبھی کچھ دھرا کا دھرا رہ گیا

بتلا ہو گیا

میں تیرے عشق میں بتلا ہو گیا

تیری جھلمل سی کرتی ہوئی شاعری

شاعری کو سمیٹے ہوئے فہم وادراک والی نئی گفتگو

آنے والے زمانے کی سچی بشارت کی اک شکل ہے

تیری جرأت

مزاحمت کا نعرہ

کسی نابلد اے بخن سنگ دل شخص سے درگزر

اور حق بات پر بے خطر بولنا

تیری پہچان ہے

کوئی سمجھے نہ سمجھے مگر میں سمجھتا ہوں

حق دار کی ہر خوشی میں کھلی بانہیں رکھنا

کسی غم زدہ کو تسلی کے شفاف پانی سے سیراب کرنا

یہ درویش کی شان ہے

کیا عجب شان ہے

ایک رستے پہ چلنا مسلسل ہی پھر چلتے جانا

چھاؤں کرتی ہوئی چادر زر کو پاؤں تلے روندنا

صرف اشعار کی مخملی اک ردا تان کر

دشت ربدہ کے اس پار جانا

جہاں پر ابوذر کی بیٹی بہت مضطرب ہے

بہت منتظر ہے کسی قافلے کی،

جہاں میر و غالب کا ڈیرہ سجا ہے

اعجاز رضوی

جہاں پر ہیں اقبال کی رفعتیں موجزن

جہاں فیض و فراز بھی جلوا گر ہیں

جہاں پر منیر اپنے اشعار سے چوکھی لڑ رہے ہیں

جہاں قاسمی کے فسانوں کا اک گاؤں ہے

جہاں دھوپ مدھم گھنی چھاؤں ہے

جہاں خالد احمد کی نظمیں چہکتی ہوئی پھر رہی ہیں

مرے محبوب فرحت،

افق پر ترے، جھلملاتی ہوئی شاعری ہے

ابھی شاعری کے مقابل طلوع ہوتی دنیا

تیری منتظر ہے

تو شعر و سخن سے ذرا سر اُٹھائے تو میں بھی

کسی اعلیٰ بچی عدالت کے ہاتف کی صورت پکاروں

کہ القاب خلعت دوشالہ

حریم سخن میں تیرے منتظر ہیں

خطوط

جمیل یوسف

مکرمی جناب عمران منظور صاحب!

السلام علیکم!

فروری 23ء کا بیاض نظر نواز ہوا۔ بہت بہت شکریہ

جناب محمد ارشاد صاحب اپنے خط میں رقم طراز ہیں:

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

''معلوم نہیں (غالب نے) کتنی پی رکھی تھی جو سامنے کا قافیہ گریزاں چھوڑ کر نمایاں لے لیا۔''

جناب محمد ارشاد صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ غالب جو بات کہہ رہا ہے اس کے لیے نمایاں کا لفظ ہی موزوں اور حسبِ حال ہے۔ معانی و مطالب کے لحاظ سے گریزاں کا لفظ صحیح نہیں۔ بلکہ غلط ہے۔ گریزاں تو خود وہ چیز ہوتی ہے جو مطلوب و مقصود ہو۔ یہاں تو غالب کی وجہ سے منزل دور ہوتی جا رہی ہے۔ غالب کی طوفان خیز رفتار سے بیاباں آگے آگے بھاگ رہا ہے یعنی راستہ خود بھاگ رہا ہے اس لیے منزل دور ہوتی جا رہی ہے۔ یہ جو دوری ہے یہ خود غالب کی وجہ سے نمایاں ہو رہی ہے، نہ کہ منزل گریزاں ہے۔ یعنی آرزو اور جستجو کی بے پناہ شدت نے یہ دوری پیدا کر دی ہے۔

اگر جناب محمد ارشاد کا مشورہ مان لیا جائے تو مصرع یوں ہو جائے گا کہ ہر قدم دوریٔ منزل ہے گریزاں مجھ سے۔ مگر یہ غلط ہے کیوں کہ منزل گریزاں ہوتی ہے، دوری منزل گریزاں نہیں ہوتی۔

جناب محمد ارشاد صاحب نے لکھا ہے کہ سامنے کا قافلہ گریزاں چھوڑ کر نمایاں لے لیا۔ ایک بڑا شاعر سامنے کی چیز تو نہیں اُٹھا لیتا۔

جناب مہر علی نے ''غالب کے ایک شعر کی تفہیم پر اچھا معلوماتی مضمون لکھا ہے۔ اقبال کا شعر نقل کیا ہے:

''سکوں محال ہے، قدرت کے کارخانے میں'' کارخانے میں۔ ثبات صرف تغیر کو ہے زمانے میں

اقبال کے شعر کا دوسرا مصرع یوں ہے:

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

سگمنڈ فرائیڈ کا جو قول مہر علی صاحب نے نقل کیا ہے۔ بڑا اہم ہے۔

"Everywhere I go I find that a poet has been there before me"

اس دفعہ غزلوں میں مجھے مندرجہ ذیل اشعار پسند آئے ہیں:

آگ میں ہم نے خود ہی پھینک دیئے	وہ جو تنکے تھے آشیاں کے لیے	نسیم سحر
دل و نظر میں سمایا رہا جمال غزل	خیال یار کی صورت رہا خیال غزل	حسن عسکری کاظمی
وہاں میں اپنی صفائی میں بولتا کیسے	جہاں یقین کی بنیاد ہی گماں پر تھی	محمد انیس انصاری
دھند باقی ہے خواب باقی ہے	راستوں کا سراب باقی ہے	
لکھی ہے ہم نے زندگی کی کتاب	بس محبت کا باب باقی ہے	شہپر طراز
یہ تو الفت کی خوبصورتی ہے	شکوے کرنا ، شکایتیں کرنا	
خاک اُڑاتے تھے ان کی گلیوں کی	اب کہاں وہ حماقتیں کرنا	خالدہ انور
اسے گوشہ نشینی راس ہے اب	کسی کے عشق میں جو دربدر تھا	شوکت محمود شوکت
اب کہاں وقت کی رفتار سنبھالی جائے	یہی ممکن ہے کہ دستار سنبھالی جائے	رضا اللہ حیدر
مری طرف سے کسی روز مل تو آنا اسے	مجھے تو دیکھے ہوئے ہو گیا زمانہ اسے	رخشندہ نوید
یہ محبت عمر بھر کا روگ ہے	جتلا ہونے سے پہلے سوچ لے	آسناتھ کنول
اس لیے تو ہم بڑے ہوتے نہیں	اپنے قدموں پر کھڑے ہوتے نہیں	افتخار شوکت
کس صورت نہ دل سے نکلی	کسی کا سودا نہ سر سے نکلا	انصر حسن
یہ عدل کی زنجیر دکھاوے کے لیے ہے	مظلوم کی سنتا ہے یہاں کون دہائی	احمد جلیل

دیکھ لیجے وہ اگر ایک جھلک عکس ترا
آئینے خود کو کئی بار سنوارا کرتے
اشرف کمال

تم ذکو کا ترجمہ نہ کرو، تجزیہ کرو
ذکو منتقل نہ ہو گا کسی بھی زبان میں

جی لگ گیا جزیرۂ تنہائی پہ مرا
کشتی سمجھ میں رکھ دی ہے صورت چٹان میں
شاہد ماکلی

کشتی کے نہ ملنے کا یقیں تھا ہمیں فیصل
ہم ڈھونڈتے پھرتے رہے تنکوں کا سہارا
فیصل زمان چشتی

وہی کہا کہ جو دیکھا ہے زندگانی میں
کوئی فسانہ نہیں ہے مری کہانی میں
اکرم جاذب

پڑ گئی شام جب اس راہ میں بیٹھے بیٹھے
موجۂ گرد نے پوچھا یہاں کیسے بیٹھے

ہر مسافر پہ ہمیں تیرا گماں ہوتا تھا
گرد کے ساتھ کئی بار ہیں اٹھے بیٹھے
سجاد بلوچ

نسیم سحر

بادیانِ بیاض   السلام علیکم

فروری ۲۰۲۳ء کا شمارہ سرورق پہ آزادیٔ کشمیر کے عزم اور یوم یکجہتی کشمیر منانے کے اعلان کے ساتھ موصول ہوا۔ اسے پڑھتے پڑھتے پانچ فروری کا وہ دن بھی گزر گیا جسے ہم علامتی طور پر ہر سال یوم یکجہتی کشمیر کے طور پر مناتے ہیں۔ اور جانے کب تک مناتے رہیں گے۔ یہی عزم دہراتے دہراتے ہمیں پون صدی گزر چکی اور شاید آیندہ پون صدی بھی گزر جائے کہ اعلان اور عمل میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ہماری طرزِ حکومت، طرزِ سیاست، ہمارے اداروں کے رویّے ممکن ہے کبھی ہمیں روشنی کی کوئی کرن بھی دکھا سکیں مگر فی الحال تو اس کا کوئی امکان دکھائی نہیں دے رہا۔ بقول شاعر ”حالاتِ حاضرہ کو کئی سال ہو گئے“۔

اس ماہ حمد و نعت کے درج ذیل اشعار نے میری توجہ کھینچی:

خلقِ عظیم نے کیے تسخیر ذہن و دل
آخر عدو بھی سایۂ رحمت میں آ گئے
جلیل عالی

تذکرہ حسنِ مکمل کا بیاں کیسے ہو
ایک ہی وصف جو لکھیں تو زمانے لگ جائیں
سرور حسین نقشبندی

جھلک رہی ہے جو سبز گنبد کی روشنی سے
کسی بھی منظر کی دلکشی میں وہ چھب نہیں ہے
علی رضا

مجھ پہ بھی بابِ علم و ہنر کھول دیجیے
اے شہرِ علم و روح و خرد سید الوریٰ
نبیل احمد نبیل

غیر ممکن ہے ثنائے شہِ والا کا بیاں
سوچنا بھی ہے عبث ایسا کہ یوں ہے یوں ہے
حسنین مظہری

اب غزلوں کے کچھ چیدہ اشعار کہ بات نہیں بنتی بات غزل پہ کیے بغیر:

جانے کس رو نے بجھا ڈالی ہیں
جانے کس دھن میں تھیں ساری آنکھیں

خوبیاں ناقدِ فن کیوں دیکھے
دشت کی آنکھ چمن کیوں دیکھے
خالد احمد

کہاں جائیں گے ثاقب اپنی بستی چھوڑ کر
زمانے میں "ہزارا" دوسرا کوئی نہیں
آصف ثاقب

یہی وہ صنفِ سخن ہے جسے عروج ملا
مرا یقین ہے ممکن نہیں زوالِ غزل
حسن عسکری کاظمی

زیادہ دیر چھپایا نہ جا سکے گا مجھے
میں گر دکھائی نہ دوں تو سنائی دیتا ہوں
راحت سرحدی

ہم وہ رفتہ کے لوگ ہیں جن پاس
روشنی ہے سفید بالوں کی
خاور اعجاز

جب تک یہ کھانا ہے تیرے گُن گائیں گے
بعد میں کچھ امید نہ رکھنا ان دستر خوانی یاروں سے
گلزار بخاری

لبِ گویا میں ثاقب اکثر لوگ
کوئی لکنت تلاش کرتے ہیں
منظور ثاقب

شہر والوں میں بھی کیا اس نے تو چالاکی سے
تخت پر نصب کیے مارنے والے مہرے
فرحت عباس شاہ

مری جیبوں میں سکے بولتے تھے
مری باتوں میں ورنہ کب اثر تھا
شوکت محمود شوکت

حسینیت کے متوالے جو آج بھی ہیں
کہیں کہیں یہ زمیں کربلا کا حصہ ہے
محمد نوید مرزا

یہ رزقِ ہنر مجھ پہ اتر آتا ہے ورنہ
یہ رزق کمانے کا تو یارا بھی نہیں ہے
افتخار شاہد

بن ادب کے علم سارا ورثۂ ابلیس ہے
ایک پہلو یہ بھی ہے قرآن کی تفسیر کا
فیض رسول فیضان

کچھ نگینے ہوتے ہیں پاپوش پر
سب انگوٹھی میں جڑے ہوتے نہیں
افتخار شوکت

بارش میں جاگتا ہوں اور کس جہان میں
قوسِ قزح ہے تیر کی طرح درمیان میں
شاہد ماکلی

میں نے کیا کرنا ہے اس قیمتی گلدستے کو
دوست ہے وہ جو مصیبت میں سرہانے بیٹھے
سجاد بلوچ

پھر کسی کام کے نہیں رہتے / جب حیا شال سے نکل جائے — ثاقب تبسم ثاقب
تم سے کہتے ہیں میں بہت خوش ہوں / میرے احباب جھوٹ بولتے ہیں — رخسانہ سحر
مرے خدا نے مجھے قید سے اماں میں رکھا / میں قید میں سے پرندے چھڑایا کرتا تھا — علمدار حسین
میں رقص کر رہا ہوں ہوا ہو نہیں رہا / ناراض ہیں ملنگ، قلندر بھی خوش نہیں — مستحسن جامی
سلطنت زیر نگیں اس کے چلی جاتی ہے / جس کو مسحور کیا جاتا ہے دریائی پہ — اعجاز رافع

جناب فرحت عباس شاہ کا مضمون "اعجاز رضوی کا تصور حیات وکائنات" خوب رہا اور انہوں نے اعجاز رضوی کی شاعری کو تجزیاتی مطالعہ کر کے اچھے نکات نکالے ہیں۔ اسی طرح محمد نوید مرزا نے ڈاکٹر سعادت سعید کی نظم نگاری کا تنقیدی جائزہ عمدگی سے لیا ہے اور بجا طور پر انہیں جدید ترین نظم نگار ٹھہرایا ہے۔ آفتاب خان کی کتاب "اردو فلمی شاعری: عروضی تجزیہ" پر جناب عرفان صادق نے خوب لکھا ہے اور خوشی ہوئی کہ آفتاب خان نے بھی اردو فلمی شاعری کا عروضی تجزیہ کر کے اسے اردو ادب کا حصہ قرار دیا ہے۔ حال ہی میں معروف شاعر، محقق اور نقاد اکرم کنجاہی کی ایک کتاب "دبستانِ فلم کے نعت نگار" شائع ہوئی ہے جو انہوں نے ازراہِ عنایت مجھے بھی ارسال کی ہے اور انہوں نے فلمی دنیا پر پڑی بہت سی گرد جھاڑی ہے۔ آفتاب خان کی کتاب تا حال نظر سے نہیں گزری لیکن یقیناً یہ بھی ایک منفرد پہلو ہوگی۔ بیاض میں شامل ایک اور اہم مضمون اختر رضا سلیمی کے ناول جندر پر عنبرین فاطمہ کا ہے جس کے عنوان کا کلیدی جملہ ایک خلوت گزیدہ شخص کا نوحہ ہے۔ اسی حوالے سے پورے مضمون میں محترمہ نے ناول نگار کے فن کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور جندر کے ان بہت سے پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے جو مجھ جیسے عام قاری کی نظر سے اوجھل رہے تھے۔

خطوط کے حصے میں جناب محمد ارشاد اپنی دانشورانہ باتوں سے چھائے ہوئے ہیں اور ان کا خط بڑے فونٹ کے سبب ویسے بھی دیگر خطوط سے الگ دکھائی دے رہا ہے۔ ویسے اس خط کا متن متقاضی تھا کہ اسے ایک مضمون کی صورت میں شائع کیا جاتا۔

افسانے، تضمین اور دوہے کے تا حال پڑھ نہیں سکا اور انہیں پھر کسی وقت فرصت سے پڑھوں گا اس لیے ان پر کوئی تبصرہ ممکن نہیں۔ سلامت رہیں۔

حامد یزدانی

السلام علیکم محترم عمران بھائی

اللہ کرے آپ مع اہل خانہ خیر سے ہوں۔ آمین

گذشتہ روز امجد اسلام امجد صاحب کی رحلت کی جاں گداز خبر ملی۔ وہ ہمارے پیارے خالد احمد صاحب کے بھی ابتدائی اور گہرے دوستوں میں سے تھے اور "بیاض" کے مستقل لکھاریوں میں بھی شامل تھے۔ بحیثیت تخلیق کار ان کی خدمات متنوع اصناف کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور بطور انسان ان کی پہچان بس ایک ہی لفظ سے ہو سکتی ہے اور وہ لفظ ہے۔ "محبت" سراپا محبت اور مروت ہستی۔ شہرت کی بلندیاں بھی ان کے مزاج میں دوستی اور ملنساری کی خوبیوں کو کم نہ کر سکیں۔

انہیں یاد کرتے ہوئے قلم برداشتہ یہ تحریر ہو گئی جو آپ کی وساطت سے "بیاض" کے قارئین کی نذر ہے۔ اس تحریر میں امجد صاحب کے ساتھ ساتھ خالد صاحب اور نجیب صاحب کی مہک بھی آپ کو محسوس ہوگی۔ ان شاء اللہ

ایک عہد دیکھتے ہی دیکھتے ہماری نگاہوں کے سامنے اپنا دامن سمیٹتا جا رہا ہے۔ سب احباب کے لیے صحت و سلامتی کی دعا کریں۔

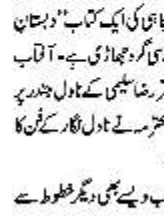

رشید آفریں

محترمی و مکرمی برادران نعمان منظور، عمران منظور صاحبان

آپ کو مجموعی طور پر مخاطب اس لیے کر رہا ہوں کیونکہ میں نے آپ کے حوالے سے ماہنامہ بیاض، لاہور کے ہمراہ اپنی عمر عزیز کے سالہا سال گزارے ہیں۔ آپ اور "بیاض" کے علاوہ ایک عظیم ہستی کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ میں نے خالد صاحب کے علم و فضل اور کلام سے بہت کچھ حاصل کیا۔ میں نے انہیں ادبی حوالے سے ایک عظیم استاد اور رہنما جانا اور ان کے اصولوں اور ضوابط سے بہت کچھ حاصل کیا۔ میں نے ان کے بارے میں جو کچھ بھی کہا یا لکھا وہ حقیقت ہے اور یہ بات رسمی نہیں تھی۔

میرے پانچویں شعری مجموعے "بزم یاراں" (ص نمبر 56) پر

خلوص و مہر کے پیکر بشر کی بات کیا کہنا / کمال فن کی ذہن فکر و نظر کی بات کیا کہنا
ہے پرواز تخیل مرحد ادراک سے بالا / فضائے شعر تک اس دیدہ ور کی بات کیا کہنا
بھٹکنے سے ہمیشہ آفریں سب کو بچاتی ہے / کسی رہبر، چراغ رہ گزر کی بات کیا کہنا

میں نے خالد کے لیے جو انتظام ماہنامہ بیاض، لاہور کے خالد احمد نمبر (جون 2014) کے لیے کہے وہ محض رسماً نہیں بلکہ میں نے ان کے اسلوب

کے ساتھ دیگر محاسن سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اور میرے ساتویں شعری مجموعے ''چراغ اخوت'' میں منظوم تاثرات ''کلیاتِ خالد احمد (عرضِ ہنر) کے منظر پر آنے کے بعد اشعار ہوئے وہ بھی میرے دلی جذبات ہیں وہ قطعاً داد حاصل کرنے کے لیے نہیں کہے گئے:

یہ کیا رو پہلی سی شاعری ہے　　تمام شعروں میں روشنی ہے
گلِ ادب کی ہے بھینی خوشبو　　مہک بسی ہے چمن میں ہر سُو
ہر ایک دل سے مثالی قربت　　بہ فیضِ شعر و سخن ہے نسبت
ہے آفریں فن کا وہ شناور　　سخن کے میداں کا بھی دلاور

آپ کو یاد ہوگا۔ پھر بھی میں اپنے الفاظ کی نقول منسلک کر رہا ہوں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ربِ کریم سے مجھے ''بیاض'' لاہور میں لکھنے کی کب تک مہلت ملتی ہے۔ ہاں البتہ آج کے ''بیاض'' کے لیے بھی کچھ پیش کر رہا ہوں۔

ثمینہ سیّد

محترم عمران منظور اور نعمان منظور صاحب کی کاوشوں کو سلام:

فروری کا بیاض یوم یکجہتی کشمیر کے نام سے خاص شمارہ نکالا گیا۔ ٹائٹل پر یوم سیاہ کی مزاحمتی تصویر کشمیر میں بچھے سوگ پر نوحہ کناں نظر آئی۔ بیاض روایت سے جڑی ہر خبر، ہر تہوار کے ساتھ منسلک رہتا ہے۔ اس کے بانی ''خالد احمد'' تھے آج تک انھی کا نام بانی مدیر کے طور پر کنداں دیکھ کر سکون کی ایک لہر دل میں سرایت کرتی محسوس ہوتی ہے۔ کہ عمران منظور صاحب، نعمان منظور صاحب جیسے بھائیوں کے ظرف اور عقیدت کی وجہ سے نظامِ ہستی رواں دواں ہے۔ ٹائٹل پر حسبِ معمول کتابوں کی تصاویر آویزاں نظر آئیں جن میں سہ ماہی اقبال، امریکا میرے آگے، اسماء الحسنیٰ اور اسماء النبیؐ، مٹی ہیٹھ تماشا، یہ چار ٹائٹل نہیں ہیں، چار جہتیں ہیں، زندگی کے چار میدان ہیں جو بیاض کی غیر جانبداری کا ثبوت ہیں۔

بام مینا سے اتری ہوئی ایک نظم، بہت اعلیٰ نظم ہے، اشاریہ میں ایک طویل فہرست رنگا رنگ ادبی سلسلوں سے مزین ہے جس میں دنیا بھر سے شاعر اور ادیب حضرات کی تصنیفات بھی ہوئی ہیں ترتیب و تنظیم بہت عمدہ ہے۔ ایک سے زیادہ حمد اور نعتوں کو جگہ دے کر اپنے شمارے کی انفرادیت کا آغاز کرتے ہوئے ''بیاض''، نظم و غزل، مضامین، افسانوں اور سفرناموں کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔

ہم خستہ و خجل تری خدمت میں آ گئے　　دنیا کی زندگی میں ہی جنت میں آ گئے

جلیل عالی کی نعت شہہِ دیں اپنے مسلمان ہونے پر اتراتی ہے۔ حسن عسکری کاظمی کی ''عقیدت'' اور محمد یٰسین قمر کی نظم بھی لاجواب ہے۔ محمد ارشاد صاحب کی رباعیات بہت اچھی ہیں، برکت سے بھری ''باتیں'' دامنِ دل بھرتی محسوس ہوئیں۔ نظموں اور غزلوں کی کثرت کے باوجود مواد کا معیار نہایت عمدہ رکھا گیا ہے۔ اعجاز رضوی صاحب کی شاعری پر فرحت عباس شاہ کا مضمون ایک جہانِ تحیر ہے۔ نظمیں بہت ہی اچھی انتخاب کی ہیں۔ مقصود جعفری، ظہیر بدر، محمد نوید مرزا اور عرفان صادق کا ''اردو فلمی شاعری عروضی تجزیہ'' آفتاب خان کی کتاب کے متعلق لکھا ہوا مضمون عرفان صادق کی ذات کا ایک اور پہلو عیاں کرتا ہے، شاعر اور اب تجزیہ کار، نقاد۔ بڑا علمی، ادبی قسم کا مضمون ہے۔ فیصل زمان چشتی، عاصم بخاری، شاہد ماکلی کے مضامین بھی بہترین ہیں۔ عہد حاضر کے ادبی کینوس پر روشنی کی کہکشاں بکھیرتے بیاض نے نظموں کے سلسلے میں جناب امجد اسلام امجد کی خوبصورت نظم ''ہجرتی پرندے'' پیش کر کے مجھ پر احسان عظیم کر دیا۔ یہ میری پسندیدہ نظم ہے۔ سارا مواد ہی ہمارے ذہن کے دریچوں کو خوشبو سے مہکا دیتا ہے۔ افسانوں میں کلیم خارجی کا مختصر سا افسانہ ''یلغار سے پہلے'' تاثیر سے بھرا ہوا افسانہ ہے۔ شارٹ لیکن شارپ اور دیرپا اثر کا حامل ہے۔ مجموعی طور پر ''بیاض'' ایک دبستان ہے۔ جس کے اندر ہر فرد کے اضطراب کو امان ملتی ہے۔ بیاض کی اس بھرپور اور زندہ روایت کے لیے بیاض کی پوری ٹیم کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔

محمد شفیق انصاری

محترم و مکرم عمران منظور صاحب　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

امید واثق ہے کہ آپ اور ''بیاض'' کی تمام ٹیم بخیر و عافیت ہوں گے۔

''بیاض'' کا شمارہ بابت فروری 2023 اپنے خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ موصول ہوا۔ ٹائٹل ''یوم یکجہتی کشمیر'' کے حوالے سے یادوں کو تازہ کرنے اپنے کشمیری بھائیوں کے ساتھ یکجہتی کا پیغام لیے ہوئے ہے۔ ہم بھی عجب قوم سے تعلق رکھے ہیں۔ سال بھر میں ایک دن جلسے جلوس تقاریر اور سونے پہ سہاگہ چھٹی کر کے ہم صرف یہ بتاتے ہیں کہ ہم دل و جان سے کشمیریوں کے ساتھ ہیں اور پھر پورا سال خاموشی۔ کشمیر پالیسی کے حوالے سے ایک مضبوط اور مکمل موقف اور لگن کی ضرورت ہے۔ اور موجودہ دنیا کے حالات اور تبدیلیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک جامع اور پائیدار حل کی ضرورت ہے تاکہ یہ مسئلہ حل ہو سکے۔ بہر حال ''بیاض'' نے اپنا بھرپور کردار ادا کیا اور اس چیز کو اپنے ٹائٹل کی زینت بنایا۔

پہلے ہی صفحے پر مرشدی خالد احمد صاحب کی خوبصورت نظم ''بام مینا سے اُترتی ہوئی ایک نظم'' جو انھوں نے 1984 میں لکھی تھی۔ اور اس کے ساتھ ایک خوبصورت حمد ''حمدیہ'' میں

اک عدالت نشیں تھے ہم ہی یہاں　　　　کوئی خاقان تھا، کوئی تاجدار

حصہ نعت میں جلیل عالی صاحب کی نعت میں:

ہر ذرۂ وجود میں جاگی ولا کی لو	فائق فضا ئے عرض و عبادت میں آ گئے	جلیل عالی
موسم وہاں کے کیوں نہ سہانے رہیں نسیم	اُس شہر میں ہے رحمتِ سرکارؐ موجزن	نسیم سحر
جو بھی ایسا ہے مدحت کا عطا ہو جاتا	ہاتھ جیسے کسی مفلس کے خزانے لگ جائیں	سردار حسین نقشبندی

محمد ارشاد کی رباعیات بھی خوب ہیں۔ سلیمان عبداللہ ڈاری کی ''باتیں'' انسان کو ایک حقیقی عشق کی طرف لے جاتی ہیں۔ اور ایک توحید فکری غماز ہیں۔ سلمیٰ اعوان نے ہمارے پیارے فرخ سہیل گوئندی کی شخصیت اور ان کی سیاحت پر ایک خوبصورت مضمون لکھا۔ فرخ سہیل واقعی ایک خوبصورت تاریخ دان اور منفرد سیاح ہیں۔ فرحت عباس شاہ نے ''اعجاز رضوی کا تصورِ حیات و کائنات'' میں اُن کی نظم نگاری کے حوالے سے مختلف گوشے اپنے قارئین پر آشکار کیے ہیں۔ عرفان صادق نے آفتاب خان کی کتاب ''اردو فلمی شاعری کا عروضی تجزیہ'' پر ایک خوبصورت مضمون لکھا اور یہ بتایا کہ شاعری کوئی آسان نہیں ہے۔ یہ فن بھی ایک مشکل فن ہے۔ نوجوان عمر علی کا مضمون ''غالب کے ایک شعر کی تفہیم'' (ہندو یونان کے فلسفے کے تناظر میں) ایک زبردست مضمون ہے۔

شوکت علی شاہ صاحب کی آپ بیتی ''شاہ داستان'' ان کے ذاتی تجربات مشاہدات اور اُن کی زندگی کا نچوڑ خوبصورت اور چشم کشا واقعات لیے آگے بڑھ رہی ہے اور قارئین بیاض کو اپنے سحر میں جکڑا ہوا ہے۔ حصہ غزل کے اشعار:

دو صدا ہیں کہ پروئی ندگی سلکِ دعا میں	سایۂ ابر ہیں ہم سایۂ دیوار نہیں ہیں	خالد احمد
غزل کی لاج رکھتا ہے ہمیشہ بے گماں	بیاض ایسا شمارہ دوسرا کوئی نہیں	آصف ثاقب
یہ مت سمجھنا کہ دل سنبھالے پڑے ہوئے ہیں	میاں ہمیں زندگی کے لالے پڑے ہوئے ہیں	شاہنواز زیدی
سوال نامہ محبت کا ہم نے حل کیا	سوال دو ہیں وہ ان میں بھی ''یا'' لگاتے ہیں	شہزاد نیّر
داد چہ داد ملے جب اسے انیس احمد	پھلتا پھولتا ہے پزیرائی سے جھوٹ	انیس احمد
روز مٹی کے چراغوں کو سنوارا کرتے	کسی طرح شہر کے لوگوں میں گزارا کرتے	اشرف کمال

فیض رسول فیضان

مخدومی عمران منظور صاحب، محترمی نعمان منظور صاحب، مکرمی اعجاز رضوی صاحب آداب!

فروری کا بیاض، وجنتِ ارضی کشمیر کے حوالے سے خوبصورت سرورق اور زنجیر شکن پس ورق کے ساتھ نظر نواز ہُوا:

جیسے کوئی فریم ہو تصویر کے بغیر　　　　فیضانؔ ہم ادھورے ہیں کشمیر کے بغیر

فرحت عباس شاہ کے سہ ماہی جریدہ ''اقبال'' کے ٹائٹل سے قلندر موصوف خود یاد آ گئے:

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے　　　　کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

کُلیاتِ منظور جھلا کا عکس دیکھ کر پتہ چلا کہ مشہورِ زمانہ مناقب و نغمات: اس سادہ و درویش تخن ور کے تخلیقی کریڈٹ میں جگمگا رہے ہیں۔

فکر و خیال کے مصنف پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال کو پرائیڈ آف پرفارمنس ملنا، ایک طرف نابینا اہلِ قلم کے لئے سرمایۂ افتخار اور دوسری طرف بینا شعراء و ادباء کے لئے مشعلِ راہ ہے۔ ڈھیروں مبارک باد۔

بانی مدیر حضرت خالد احمد کی، بام مینا سے اُترتی ہوئی ایک نظم، بھی حسبِ معمول، اُن کا نمائندہ ادب پارہ ہے۔ خالد صاحب صرف فکر و فن کے حوالے سے ہی سرشار و شاداب نہیں کرتے بلکہ ہیئت اور فارم کے اعتبار سے بھی حیران (اپنوں کو) اور پریشان (بیگانوں کو) کر کے رکھ دیتے ہیں۔ زیرِ نظر نظم بھی ایسی ہی کیفیات کا طلسماتی پیکر ہے۔

حمد و نعت اور مناقب کے کلام ہائے معجز مقام، حسبِ روایت خوب و مرغوب ہیں۔ ایمان کی روشنی اور ایقان کی چاشنی سے لبریز اشعار کی کہکشاں سجی ہوئی ہے:

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

قادر الکلام حضرت ارشاد صاحب کی رباعیات کا ظاہری اور فوری تاثر تو سیاسی نوعیت کا ہے لیکن عمیق مطالعے سے بصارت و بصیرت کے ایسے متعدد دریچے بھی کھلتے چلے گئے ہیں جن کا دریچہ بلا مبالغہ، آفاقی و کائناتی رفعتوں سے ہمکنار ہے۔ جناب ارشاد نے اپنے بیش قیمت مکتوب گرامی

میں مجھ خاکسار کی، میری حیثیت سے بڑھ کر پذیرائی و حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ ہر مُو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے۔ سراپا دعا ہوں:

اللہ کرے زورِ کلام اور زیادہ

سلمیٰ اعوان کا مضمون نجیب عارف کتاب گوکھڑی ...... ایک منفرد سیاحت نامہ، اختصار میں جامعیت کی شان لئے ہوئے ہے جس کے مطالعے سے گوکھڑی صاحب کی ہمہ جہتی کا احساس ہوتا ہے۔ میتھیل ہولی بیک کی غیر مطابقتی نظمیں، حامد یزدانی کی اچھی تحریر ہے جس میں فرانسیسی شاعر کے مزاحمتی تخلیق کاروں کا خوبصورت تعارف کروانے کے ساتھ ساتھ کامیاب منظوم ترجمے کو تخلیقی سطح سے ہم آہنگ کیا گیا ہے۔ بہت ہی ستائش۔ اعجاز رضوی کا تصورِ حیات و کائنات، میں فرحت عباس شاہ نے اردو کے اس منفرد و معتبر نظم نگار کا ارفع و اعلیٰ مقام دکھانے کی پُرخلوص مساعی کی ہے۔ رضوی صاحب سے گذارش ہے کہ پلیز، بیاض، کو بھی اپنی تازہ شاعری سے نوازتے رہا کریں۔ بہت شکریہ! الگ راستوں کا ذکر، مقصود جعفری کے مضمون میں کا تعین، ڈاکٹر طلعت شبیر کے مجموعۂ کلام کا بھی نام ہے۔ مضمون مدلل مدحیہ نہیں بلکہ سنجیدہ انتقادیہ ہے۔ شبیر صاحب کا ایک قیامت شعر:

میں اپنے گاؤں کو پھر لوٹ جاؤں   یہی اب دل میں حسرت رہ گئی ہے

ممتاز دانشور شاعرہ، فہمیدہ ریاض کی شاعری پر محمد ظہیر بدر نے جاندار اظہار خیال کیا ہے۔ معترضین کے نزدیک موصوفہ کا کلام، اخلاقیات کے لئے ضرر رساں ہے جبکہ مداحین اس کلام کو صداقت نگاری کا شاہکار ٹھہراتے ہیں۔

قد آور نقاد ڈاکٹر سعادت سعید پر محمد نوید مرزا کا مضمون، ہمیں بتاتا ہے کہ موصوف تنقید کے ساتھ تخلیق خصوصاً جدید ترین نظم نگاری میں بھی صفِ اول کے شاعر ہیں۔ عرفان صادق نے "اردو ظلی شاعری..... عروضی تجزیہ" میں مطلوبہ متعلقہ حوالہ جات کا چمنستان تو کھلا دیا ہے تاہم اختصار کے باعث تشنگی بھی دامن گیر ہے۔ فیصل زمان چشتی نے محمد علی فضل کی پنجابی شاعری کا متوازن محاکمہ کیا ہے۔ فضل صاحب کے دو کھرے شعر:

واگر برف دے گھر جاتا اے   مٹی بیٹھاں کو چاتا اے
مٹی بیٹھ تماشا کیہ اے   جھتوں کے نہ مڑ آنا اے

عاصم بخاری نے جاوید قاسم کی شاعری کا خوش آئند تجزیہ پیش کیا ہے۔ قاسم صاحب کے دو دلکش شعر:

طلوعِ صبح سے پہلے تھا معتبر کتنا   وہ ایک چاند کہ روشن تھا رات بھر کتنا
بدن کے دشت کے آگے بھی راستے ہیں بہت   لپٹ گیا ہے مرے پاؤں سے سفر کتنا

میر علی نے غالب کے ایک شعری تجزیہ کا خاطر خواہ حق ادا کیا ہے۔ یونانی فلسفیوں کے حوالے بر محل ہیں تاہم اردو شعراء کے متعلقہ اشعار کی شدید کمی کھٹک رہی ہے۔ گنجائش کے پیش نظر بات سمیٹ رہا ہوں۔ براہِ کرم، کسی وقت، بیاض کا کوئی خاص نمبر شمارہ بھی شائع فرما دیں کہ اب تو نعت نمبر، غزل نمبر، سلام نمبر چھپے ہوئے عرصہ گذر گیا۔ غزلیں، نظمیں، افسانوی اور دیگر حصے بھی متاثر کن اور مسحور کار ہیں۔ چند منتخب اشعار اور ایک تازہ غزل کے ساتھ اجازت۔

اشرف کمال

محترم عمران منظور نعمان منظور صاحب

السلام علیکم!

فروری ۲۰۲۳ء کا شمارہ یوم یکجہتی کشمیر کے سرورق کے ساتھ ملا پڑھ کر خوشی ہوئی۔ ماہنامہ بیاض جس طرح شعری اور نثری روایت کو ایک طویل عرصے سے نبھاتا چلا آرہا ہے اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ کلام اور مواد کا معیار اپنی جگہ، پیشکش کا انداز بھی خوب تر ہے۔

ابتدا میں "بام مینا سے اتری ہوئی ایک نظم" کے عنوان سے خالد احمد کی نظم ملاحظہ کی:

سرِ طاقِ سماع روشن ہو   اے چراغِ دیارِ گویائی

خالد احمد کی حمدیہ شاعری کا آخری شعر اپنے اندر پوری نظم کا جوہر سمیٹے ہوئے ہے:

آنکھ سر پھوڑتی رہی خالد   اور منہ دیکھتی رہی دیوار

حسب سابق حمد باری اور نعتیہ کلام سے آغاز کیا گیا۔ جلیل عالی کا یہ نعتیہ شعر دیکھئے:

سارے جہاں میں دید تری اک نگاہ کی   قرنوں کے سب نشاں تری ساعت میں آگئے

اس بار بیاض میں رباعیات بھی شامل کی گئی ہیں۔ محمد ارشاد کی یہ رباعی خوب ہے:

ہر کھیل سے الگ سیاست کا کھیل   بے جوڑ سے جوڑ اور انمل سے میل
ہے صبح کو کُٹ مکا، تو شب کو ان بن   منڈھے چڑھتی دکھائی دیتی نہیں بیل

اعجاز رضوی کے حوالے سے فرحت عباس کا مضمون اور اس کا حاصل یہ شعر:

شاعروں کی صحبت کا ادنیٰ تحفہ ہے   ہاتھوں پہ دستار اٹھائے پھرتا ہوں

تم فقط اعجاز رضوی ہو / تمھارے ہاتھ میں لفظوں کا شیشہ ہے / کہ یہ شیشہ فقط تم ہو۔
مقصود جعفری کے مضمون "الگ راستوں کا دکھ" میں نجی ان کا جملہ اچھا لگا
"وصالِ دوست جنت اور فراقِ دوست دوزخ ہے"
غزل کے حوالے سے درج ذیل اشعار پسند آئے:

وہم در وہم تھا　　جو تھا پیشِ نظر　　امجد اسلام امجد
زیادہ دیر چھپایا نہ جا سکے گا مجھے　　میں گر دکھائی نہ دوں تو سنائی دیتا ہوں　　راحت سرحدی
ہمارے جیسے یہاں خال خال ہیں میر　　جو عکسِ یار کو دل کی جگہ لگاتے ہیں　　شہزاد نیر
شرطِ اول ہے دوست داری میں　　ساتھ دینا، نباہتے کرنا　　خالدہ انور
ہم سے ناتوانی ہو گئی ہے ہمیں　　اس دیوار میں چنا ہوا ہے　　اوصاف شیخ
کر گئے کوچ قیدی مگر　　شورِ زنجیر پا رہ گیا　　شہاب صفدر

گلزار بخاری، جلیل عالی، رخشندہ نوید، خاور اعجاز، آ۔ ساجد کنول، اکرم ناصر، اصغر علی بلوچ، نسیمِ سحر کی غزلیں خوب ہیں۔ نظمیں اپنے اپنے موضوع کی مناسبت سے اچھی لگیں۔ ماہنامہ "بیاض" کا یہ شمارہ بھی ترتیب و تزئین اور مواد کے حوالے سے خوب رہا۔

رانا محمد شاہد

محترم عمران منظور و اعجاز رضوی　　السلام علیکم!
فروری کا بیاض یومِ یکجہتی کشمیر کے حوالے سے خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ ملا۔ بیاض پر تبصرہ لکھنے بیٹھا ہی تھا کہ مختلف واٹس ایپ گروپس پر یہ خبر ملی کہ معروف شاعر، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار امجد اسلام امجد انتقال کر گئے۔ سچ پوچھیں تو امجد صاحب کی اچانک وفات نے اداس کر دیا۔ کچھ لمحوں کے لیے تو یقین ہی نہ آیا۔ پاکستان اور پاکستان سے باہر ادبی تقریبات ان کے بغیر مکمل نہ ہوتی تھیں۔ لاہور میں کسی بھی ادبی تقریبات میں شامل ہوا، ایک آدھ بار چھوڑ کر سبھی میں موجود تھے۔ ان کے کالموں، ادبی چاشنی کی وجہ سے لاکھوں لوگ ان کے ریڈر تھے۔ سلیمان عبداللہ ڈار کی تصوف بھری باتیں ہر مہینے روح کی تازگی کا باعث بنتی ہیں۔ فروری کے مضمون کا پہلا پیرا پڑھتے ہوئے والد کے دنیا سے جانے کے بعد کا وقت یاد آ گیا۔ دکھ اور کرب کی اس کیفیت کو دیکھ کر ایک دن چھوٹی ہمشیرہ نے کہا کہ کوشش کرو اپنے دل کی بات اپنے اللہ سے کرو۔ مجھے یاد ہے دوسروں سے وہ باتیں کرنے کے قول کا بوجھ ہلکا ہوگا اور سکون آئے گا۔ اپنی کیفیت، اپنے دکھ کو اللہ کے سامنے رکھ دو گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اطمینان بھی اور سکون بھی اور صبر بھی۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ ایک دن مسجد میں وہ ان لمحات میں جب دعا کو ہاتھوں کے راستے باہر آنے لگا تو نماز کے فوراً بعد سب بھی مل گیا۔ انھوں نے سچ لکھا کہ جب بھی وہ ہوتو رب کو یاد کرنا ہی اس درد کی میڈیسن ہے۔ رب کو درد کے ساتھ یاد کرو گے تو کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ اس لیے کہ رب تو انسان کے ہر دکھ درد، ہر تکلیف کو جانتا ہے اور یہ خیال واقعی کس قدر تسکین ہے کہ بندے کے رب کو اس کے درد کی خبر ہے۔ شکایت ہو بھی کیوں، درد اور غم تو خالق کی امانت ہے۔
فرخ سہیل گوئندی کے سفرنامے پر سلمیٰ اعوان نے دلچسپ تحریر لکھی۔ فرحت عباس شاہ نے اعجاز رضوی کی غزل اور نظم پر خوب لکھا۔ ان کے لکھے پہلے ہی اعتراف سے اتفاق ہے مگر یہ بھی ہے کہ غزل اور نظم کا اچھا ہونا الگ بات ہے اور مشہور ہونا الگ۔ فہمیدہ ریاض کی زندگی اور شاعری پر محمد شعیب مرزا کے قلم نے دلچسپ لکھا۔ اختر رضا سلیمی کے مشہور ناول "جندر" پر تحریر فاطمہ کا سیر حاصل تجزیہ پڑھنے سے لائق تھا۔ جلیل عالی، عمران منظور اور ناصر کی آج کل ناول پر یہ ہے تو ایسے میں ناول کی صنف پر سنجیدہ کام کرنے والوں کی پذیرائی ہونی چاہیے۔ امجد اسلام کی غزل پڑھتے ہوئے ان کی بہت یاد آئی۔ مختلف ادبی تقریبات میں ان کو دیکھنے اور ملنے کے خاطر ذہن کی سکرین پر چلنے لگے۔ 2016 میں ان کے ہاتھوں ایک تقریب میں ایوارڈ ملا تھا۔ ان کی غزل کے یہ اشعار اس طرف ترجمانی کر رہے تھے، جس پر وہ چلے گئے ہیں:

درد کی رہگزر اور تنہا سفر
زندگی کی سزا موت ہے ہم سفر
وہ جو آ کے گئے کوئی ان کی خبر؟

قومی اخبارات میں ان پر شائع ہونے والے خصوصی ایڈیشنز اور سوشل میڈیا پر ان کا ذکر بتا رہے تھے کہ عوام بھی ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ امجد اسلام امجد کی یہ نظم تو بہت مشہور ہے اس میں انھوں نے اپنی یادگار الفاظ میں پرو دیا ہے: مجھے زمانہ طالب علمی سے ان کی یہ نظم بہت پسند تھی:
"کرو جو بات کرنی ہے / اگر اس آس پر بیٹھے کہ دنیا صرف تمھیں سننے کی خاطر گوش بر آواز ہو کر بیٹھ جائے گی / تو ایسا ہو نہیں سکتا / زمانہ ایک لوگوں سے بھرا فٹ پاتھ ہے جس پر / کسی کو ایک لمحے کے لیے رکنا نہیں ملتا / بٹھاؤ لاکھ تم پہرے / تماشا گاہِ عالم سے گزرتی جائے گی خلقت / بنا دیکھے بنا ٹھہرے / کرو جو بات کرنی ہے۔"
اور یہ غزل بھی اسی دور کی یادگار تھی:

کہاں جا کے رکنے تھے راستے کہاں موڑ تھا اسے بھول جا
وہ جو مل گیا اسے یاد رکھ جو نہیں ملا اسے بھول جا

امجد اسلام امجد کی ایک اور خوبصورت غزل کا شعر:

اپنی گلی میں اپنا ہی گھر ڈھونڈتے ہیں لوگ　　امجد یہ کون شہر کا نقشہ بدل گیا

نظموں میں نسیم سحر کی "دھند"، طالب انصاری کی "ہم نشین ماسٹر" اور اشرف نقوی کی "شام اترتی ہے" پسند آئیں۔ سرور حسین نقشبندی نے آٹے کے حوالے سے مجموعی صورتحال اور ایک واقعہ کو بڑی خوبصورتی سے لکھا۔

Minhaj University Lahore

حسانؓ بن ثابت سینٹر فار ریسرچ ان نعت لٹریچر منہاج یونیورسٹی لاہور

اور نعت فورم انٹرنیشنل کے باہمی اشتراک سے

دوسری قومی ادبی نعت کانفرنس 2023

12 مارچ، 2023

Conference Theme:

پاکستانی نعتیہ ادب کے 75 سال

نعتیہ ادب سے وابستہ ملکی اور بین الاقوامی نامور شخصیات شرکت کریں گی

FOR ONLINE REGISTRATION:

Please visit website or **Scan QR code:**
https://www.mul.edu.pk/english/event-registration/

رابطہ برائے دیگر تفصیلات:

راشد حمید گلیامی
(ڈپٹی ڈائریکٹر HCRN)
0333-5259264

سرور حسین نقشبندی
(چیئرمین نعت فورم انٹرنیشنل)
0300-8442475

جناب شکیل جاذب، جناب عباس تابش، جناب امجد اسلام امجد، محترمہ بشریٰ رحمٰن، جناب نجیب احمد، جناب جلیل عالی، جناب جمشید چشتی
جناب اعجاز رضوی، جناب ڈاکٹر شہریار، جناب حبیب الرحمٰن، جناب نعمان منظور، جناب منصور فائز اور جناب عمران منظور

EME(DHA) سوسائٹی میں امجد اسلام امجد کے نام سے لین کے افتتاح کے موقع پر جناب اعجاز رضوی، جناب نعمان منظور
جناب کرنل ظفر نیازی، جناب امجد اسلام امجد، جناب عمران منظور، جناب نجیب احمد، جناب اسرار چشتی اور جناب جمشید چشتی

کلیاتِ خالد احمد (عرضِ ہنر) کی تقریب میں جناب عمران منظور، جناب عباس تابش، جناب نجیب احمد، جناب ڈاکٹر خورشید رضوی
جناب ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، جناب اعجاز رضوی اور جناب امجد اسلام امجد